Registered No. L. 4186

جمادی الآخرہ ۱۳۵۹ھ

جلد ۱۶ — عدد ۶

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک - پونچھ روڈ - لاہور

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلا توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھہ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۴/- مجلد ۱/۸/- محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاخریٰ سنہ ۵۹ھ (مطابق ماہ اگست سنہ ۴۰ء) جلد ۱۶ - عدد ۶

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر، دین محمدی الکٹرک پریس سرکلر روڈ - لاہور

میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک،

پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذارش

گذشتہ ماہ ستمبر کی ابتدا سے مسلسل خرابی صحت کا شکار رہوں ۔ اسی زمانہ میں علیگڈھ کا سفر پیش آیا اور چند روز غیر معمولی دماغی محنت کرنی پڑی ۔ اسکے بعد سے تو جسمانی قوتوں نے گویا مکمل ہڑتال ہی کردی جسکا سلسلہ کسی حد تک اب بھی جاری ہے ۔ اسی وجہ سے یہ پرچہ اتنی دیر سے نکل رہا ہے، اور افسوس ہے کہ اس پرچہ میں "اشارات"، اور "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" دونوں مفقود ہیں۔

اب رسالہ کی اشاعت میں اس قدر تاخیر واقع ہو چکی ہے کہ اسکو بروقت لانے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی کہ رجب، شعبان اور رمضان (یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر) کو ملا کر تینوں مہینوں کا ایک مجموعی نمبر نکال دیا جائے۔ چنانچہ آئندہ پرچہ اسی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے، اور اگر تائید الٰہی شامل حال رہی تو امید ہے کہ وسط نومبر تک ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔

اس سہ ماہی نمبر میں آپ کو میرے خطبات یکجا ملینگے جنکی تعداد تیس کے قریب ہے۔ دو تین سال قبل ان میں سے چار یا پانچ خطبے متفرق طور پر "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئے تھے۔ باقی سب کے سب اس رسالہ کے ناظرین کے لیے نئی چیز ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ مجموعہ "رسالہ دینیات" کا تکملہ ہے۔ رسالہ دینیات میں عقائد اور نظام شریعت کا بیان تھا۔ اس میں روحِ دین اور عبادات کی تشریح ہے۔ اور زبان و انداز بیان کے اعتبار سے یہ اُس سے بھی زیادہ سہل و عام فہم ہے۔

ابو الاعلیٰ

۲۵ ر اکتوبر سنہ ۴۰ء

مقالات

تفریق دین و سیاست

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

مسلم ممالک بالخصوص ٹرکی میں بیسویں صدی کی ابتدا سے جدید تعلیم یافتہ اور "ترقی پسند" گروہ میں دین و سیاست کی تفریق کا رجحان پیدا ہو گیا جسکا مقصد یہ تھا کہ ملک کے نظم و نسق، قانون سازی اور سیاسی معاملات کو دینی احکام و تعلیمات کی پابندی سے بالکلیہ آزاد کر دیا جائے۔ خالص دنیوی تعلیم پائے ہوئے لوگ ان معاملات کو دنیوی طریق پر چلائیں اور علمائے دین کا منصب خالص دینی رہنمائی اور مذہبی رسوم و فرائض کی ادائیگی قرار پائے۔ ۱۹۲۳ء میں اُس خیال کے لوگوں کو ٹرکی پر کلّی تسلط حاصل ہوا اور ایک دو سال کے اندر اندر انھوں نے ٹرکی کے نظام حکومت اور نظام تمدن و معاشرت کو دین کے جملہ اثرات سے پاک کر کے ٹرکی کو ایک خالص دنیوی ریاست بنا دیا۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کے ساتھ یہ رجحان پہلے سے موجود تھا۔ لیکن ۱۹۲۳ء سے مختلف اسباب کی بنا پر یہ خیال جدید طبقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب و محرکات ٹرکی سے بالکل مختلف ہیں مگر دینی اقتدار اور اسلامی زندگی کے حق میں نتیجہ یکساں ہے۔ یہ مسئلہ ہماری ملی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اور جذبات و اثرات سے ہٹ کر فریقین کے کامل غور و فکر کا محتاج ہے۔ میں اس مسئلہ کی تاریخ، مختلف ممالک میں اس کے اسباب و دواعی، اور اسکے نتائج پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ غنیمت ہے کہ کم از کم ہندوستان میں ابھی اسلامی نقطۂ نظر کی اہمیت باقی ہے۔ ورنہ دوسرے

ممالک میں تو اس کا شمار امور فیصل شدہ میں ہونے لگا ہے۔

مذہب و سیاست کی تفریق اور دنیا کے معاملات سے دین داروں کی علحدگی کا خیال یورپ میں مذہب عیسوی کی بدولت پیدا ہوا ہے اور وہیں سے مسلم ممالک میں آیا ہے اسلیے ہمیں سب سے پہلے اسکی تاریخ اور اسکے ماحول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مسیحیت اور تفریق دین وسیاست مسیحی مذہب دراصل محض ایک روحانی اور صوفیانہ تعلیم کا نام ہے جسکا سارا سرمایہ حضرت مسیح کی زندگی کے صرف آخری تین برس کے غیر مرتب واقعات، معجزات اور مواعظ و امثال ہیں۔ اُن میں کوئی دستور حیات، ضابطۂ سیاست اور قانون و آئین نہیں۔ یا اگر تھا تو یہودیوں اور رومیوں کے خوف سے ہمیشہ باغیانہ اور انقلابی لٹریچر کی طرح چھپایا گیا یہانتک کہ حقیقتاً گم ہو گیا اور دنیا نے اسکے متعلق کبھی کچھ نہ جانا۔ یا اُن حوادث میں جو ابتدائی مسیحی صدیوں میں پیش آئے مسیحی تعلیم کے بہت بڑے سرمایہ کے ساتھ ضائع ہو گیا۔ بہرحال بات ایک ہی ہے مسیحی علمار کے پاس ایسی کوئی چیز کبھی نہ تھی جس سے وہ زمین کے کسی مختصر سے مختصر حصہ میں مختصر سے مختصر مدت کے لیے بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی نظام حکومت قائم کر سکتے اور چلا سکتے۔ اس مذہب کے ابتدائی پیرو علمار و مبلغین ناموافق حالات اور اپنے مذہب کی رو سے مجبور تھے کہ راہبانہ اور صوفیانہ زندگی گذاریں۔ تیسری صدی تک یہ بات اُن کے تصور میں بھی نہ تھی کہ اُنکے مذہب کو کبھی مادی اقتدار حاصل ہوگا۔ نہ انہوں نے کبھی اسکی کوشش کی۔ ۳۱۲ء میں جب قسطنطین اول نے مسیحی مذہب قبول کیا تو یکایک یہ مذہب سرکاری مذہب بن گیا اور سیاست سے اسے دو چار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ صوفیانہ و راہبانہ مذہب جسکی تعلیم تھی کہ شریر کا مقابلہ نہ کر، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے، اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اسکے ساتھ دو کوس چلا جا، اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور

اپنے ستانیوالوں کے لیے دعا مانگ، ایسا مذہب حریص فاتحوں کا ایک دن بھی ساتھ نہ دیسکتا تھا مگر ہندوستان کے بدھ سلاطین کی طرح مسیحی سلاطین نے محض اپنی شاہانہ قوت سے اس آب آتش کو جمع کردیا علماء و پیشوایانِ مذہب نے بادشاہ کو سیاسی و انتظامی امور میں آزاد و خود مختار رکھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیاوی معاملات میں وہ اسکی رہنمائی نہیں کرسکتے۔ لیکن علماء اپنے معاشی حالات کی وجہ سے اور اپنے جاہ و منصب کے لیے دربار کی سرپرستی سے اور دربار اپنے سیاسی مصالح و ضروریات کی وجہ سے علماء و پیشوایانِ مذہب کی خدمات و امداد سے زیادہ دنوں تک بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے اس مشترک احتیاج کی وجہ سے سرحدیں برقرار نہیں رہ سکیں اور رفتہ رفتہ علماء اور مشائخ نے وقت کی سیاست، قصر شاہی کے معاملات، اور قوم کی ذہنیت اور نفسیات میں دخل پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے مذہب سے زیادہ اپنے مذہبی اقتدار اور اپنی ذاتی قابلیت سے فائدہ اٹھایا کچھ ہی عرصہ بعد کلیسا کو وہ اقتدار حاصل ہوگیا جس پر بڑی سے بڑی شہنشاہی رشک کرسکتی تھی۔ ارباب کلیسا سلاطین کا عزل و نصب کرتے تھے اور بساطِ سیاست پر شطرنج کھیلتے تھے۔ رومی کلیسا مسیحی دنیا کا روحانی قبلہ، ذہنی سرچشمہ اور قصر حکومت تھا۔ اسوقت حقیقتاً سیاست مذہب کے اقتدار میں آگئی تھی۔ لیکن یہ کشتی جس میں دو مختلف سمتوں میں بادبان لگے ہوئے تھے صرف اس وقت تک چل سکتی تھی جب تک کہ ایک رخ کی ہوا چلتی رہے۔ مذہب مسیحی اور سیاست مادی کے رخ بالکل مختلف اور ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ شائد یہ کشتی کچھ دن اور طوفان کا مقابلہ کرتی لیکن پیشوایانِ مذہب نے اپنا بادبان خود شکستہ کردیا۔ انہوں نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وہ پاکباز، فرض شناس انسان اور اخلاق کے علمبردار بننے کے بجائے مقدس دیوتا، لالچی سوداگر، اور عیاش فاتح بنگئے۔ انہوں نے اجتماعی مفاد کو اپنی شخصیت میں فنا کرنا چاہا۔ علم و اجتہاد کے چشمے خشک کردیئے۔ فکر و نظر کے راستوں پر چوکی پہرے بٹھا دیئے۔ دین کو سراسر دکانداری اور علم کو تمام تر عیاری کا فن بنا دیا۔ اپنے اقتدار اور

جاہ کے لیے ہزاروں عقائد اور فرقے بنائے۔ فضول مذہبی مناظروں کا بازار گرم کیا۔ بے اصل باتوں پر جھگڑے برپا کیے۔ دوراز کار جزئیات و فروع پر اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کیا۔ اپنی تمام تر توجہ اور قابلیت مضحکہ خیز مسائل کی تحقیق و تدقیق پر صرف کرنی شروع کی تحقیق اور علمی ترقی کا دروازہ بند کر دیا۔ ہر مفید و معقول تحریک، ہر بے ضرر تبدیلی اور ہر اس ترقی کی جو خدا پرستی کے خلاف نہ تھی، خواہ مخواہ مخالفت کی۔ ہر تحقیق اور ہر اکتشاف کو بے دینی ٹھیرایا۔ روشن خیال، ترقی پسند اور علم دوست گروہ کو جو پیدا ہو رہا تھا اور جسکو پیدا ہونا تھا کچل دینے کی کوشش کی۔ انکو قتل کیا، زندہ جلایا، قید کیا، جلاوطن کیا اور بلاوجہ مذہب و عقلیت میں ہمیشہ کے لیے رقابت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ان مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ساتھ نفس دین سے، دینی اقتدار سے، دین کی رہنمائی سے، حتیٰ کہ خود خدا تک سے بیزار ہو گئے۔

یہ حالات سو پچاس برس نہیں، صدیوں قائم رہے۔ پندرہویں صدی کی انتہا اور سولہویں صدی کی ابتدا اس عقلی جمود اور اس مذہبی بربریت کا تاریک ترین عہد ہے۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اسکے خلاف ردعمل شروع ہو اور اس خاص قسم کی مذہبیت اور اس نوع کے نمائندگان مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند ہو جائے۔ چنانچہ پندرہویں صدی میں یورپ میں دو شخص پیدا ہوئے اٹلی میں میکیاولی فرنسادی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء)۔ اور جرمنی میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء)۔ دونوں کے اصول و مبادی میں فرق تھا مگر دونوں کی کامیابی کلیسائی اقتدار پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ میکیاولی کی تحریک خالص سیاسی اور وطنی تحریک تھی۔ اسکی تبلیغ تھی کہ "مذہب کو سیاست کے ماتحت رکھنا چاہیے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے جو ہر شے پر مقدم ہے۔ عیسائیت کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ نیکوکار انسانوں کا وجود کلیسا کے لیے مفید ہو سکتا ہے، لیکن حکومت کے لیے مفید نہیں، کیونکہ وہ

لوگ ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ انسان فطرةً مجبور ہے اسلیے ساری طاقت حکومت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اخلاق کی دو قسمیں ہیں، پبلک اور پرائیویٹ۔ پرائیویٹ اخلاق سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں "۔ لوتھر کی تحریک مذہبی اور اصلاحی تحریک تھی۔ اسکو اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جرمن قوم کی شرافت و عظمت سے اپیل کرنی پڑی اور رومی کلیسا کے اقتدار کے خلاف جذبۂ قومیت کو بیدار کرنا پڑا۔ آخر کار اس تحریک کا انجام بھی یہ ہوا کہ کلیسا کی اتحاد پرور بندش سے الگ ہو کر تمام قوموں نے اپنے اپنے قومی کلیسا الگ بنا لیے، مذہب کا ہمہ گیر انسانی تصور مٹ گیا اور ہر قوم اپنے قومی مذہب کی معتقد ہو گئی، اور اس چیز نے قوم پرستی اور قوموں کی باہمی نزاع و کشمکش کی وہ لعنت یورپ اور یورپ سے متاثر ہونے والی قوموں پر مسلط کی جس کا خمیازہ آج یورپ کے ساتھ ساری دنیا بھگت رہی ہے۔

کلیساؤں کی ذہنی غلامی سے آزادی اور کلیسائی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی یورپ میں علمی تحقیقات و انکشافات اور تمدنی ترقی کا دور شروع ہوا اور اس تہذیب نے نشو و نما پایا جسے آج ہم مغربی تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان تبدیلی سے یورپ کو اگرچہ فوائد حاصل ہوئے تو انکے ساتھ اسکو چند شدید نقصانات بھی پہونچے۔ اول تو، جیسا کہ ابھی اوپر اشارہ کیا گیا، مسیحی دنیا کی وہ وحدت فکر، وحدت تہذیب اور وحدت سیاسی ختم ہو گئی جو رومی کلیسا کی جوڑنے اور ملائے رکھنے والی قوت کی وجہ سے قائم تھی، اور اس وحدت کی جگہ وطنیت اور قومیت نے لے لی جس سے بڑھ کر دنیا کی صحت کے لیے کوئی زہر دریافت نہیں ہوا۔ لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے کانوکیشن ایڈرس میں بالکل صحیح کہا کہ:

> "جب لوتھر کی تحریک نے جسکو اصلاح مذہب کی تحریک کہا جاتا ہے یورپ کی تہذیبی اور مذہبی وحدت کو فنا کیا تو یہ براعظم مختلف قومی ریاستوں میں بٹ گیا جنکے آپس کے جھگڑے آج دنیا کے امن کے لیے مستقل خطرہ بنگئے ہیں۔"

دوسرا نقصان یہ پہونچا کہ یورپ کی سیاست دیو بے زنجیر بنگئی جسکے لیے اخلاق و شریعت کی کوئی روک نہیں رہی - میکیاولی نے جو آج یورپ کا سیاسی پیغمبر بنا ہوا ہے اور جسکی کتابیں، اہل مغرب کے لیے صحف سماوی کا درجہ رکھتی ہیں - پہلے ہی لکھدیا تھا کہ "اپنا مقصد حاصل کرنیکے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے" اس میں اخلاق وغیرہ کا کوئی سوال نہیں - قومی اقتدار کا جہاں سوال ہو وہاں انصاف، رحم، صداقت، پاس عہد، اور دیانت سب باتوں کو بالائے طاق رکھدینا چاہیے - میکیاولی کے بقول "حکمرانوں کو اپنے اندر لومڑی کی صفات پیدا کرنی چاہئیں" بہرحال یہ دن اس غیر مکمل مذہب کی وجہ سے، جسکا نام مسیحیت ہے، کبھی نہ کبھی پیش آنے والا تھا - حاملین مذہب کی نالائقی نے اسکو اور قریب کردیا - مذہب مسیحی کی ساخت ہی کچھ تھی ہی ایسی کہ وہ دنیوی زندگی کا ساتھ ایک دن نہ دے سکتا تھا لوگ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مذہب و سیاست میں نباہ نہ ہوسکا، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کس مذہب و سیاست میں نباہ نہ ہوسکا - علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اسلام اور دین وسیاست | لیکن اسلام مسیحیت کی طرح چند عقائد اور چند مذہبی رسوم کا نام نہیں ہے

جو ہر نوعیت کے تمدن میں، ہر قسم کے قانون اور ہر قسم کے نظام حکومت کے تحت ہر طرز زندگی کیساتھ برتے جاسکتے ہوں۔ وہ تو ایک جامع نظریہ حیات ہے جسکی بنیاد پر عقائد، افکار، اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست اور تعلقات بین الاقوام کا ایک پورا نظام اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بنتا ہے۔ اس کا دین اسکی دنیا سے جدا نہیں۔ اس کا اخلاق اسکی سیاست سے الگ نہیں۔ اسکے عقائد اسکے قانون سے بے تعلق نہیں۔ اسکی عبادت اسکی معاشرت و معیشت سے غیر مربوط نہیں۔ وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک متحد المزاج ہمہ گیر نظام فکر و عمل ہے جسکے اجزاء ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ نہیں کیے جاسکتے اور ایک جزء کو رد کرکے دوسرے جزء کو قبول کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس کے دائرے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک چیز کو آپ لے کر کہیں کہ یہ مذہب ہے، اور دوسری چیز کو اس سے الگ کرکے کہیں کہ یہ سیاست ہے۔ نہیں، یہاں جس چیز کا نام مذہب ہے اسکی بنیاد پر سیاست کی عمارت اٹھتی ہے، اور وہ سیاست، سیاست نہیں بلکہ شرارت اور خباثت ہے جو دین سے آزاد ہو۔ اسلام کسی غیر دینی سیاست کا ضمیمہ نہیں بن سکتا۔ وہ حکمرانی و جہانبانی کے لیے خود اپنا ایک واضح دستور العمل رکھتا ہے، اور اس دستور کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو پورے اسلام پر ایمان رکھتے ہوں نہ کہ اسکے کسی جزء پر۔

عہد رسالت و خلافت راشدہ رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جامعیت دینی و دنیاوی کا مظہر اتم تھی آپ بیک وقت مسجد نبوی کے امام، مدینہ کی عدالت عالیہ کے قاضی القضاۃ، ملک کے حاکم و منتظم، قوم کے امیر و حکمراں اور میدان جنگ کے کمانڈر انچیف تھے، اسلیے آپکی موجودگی میں ایک منٹ کیلیے بھی مذہب و سیاست کی تفریق کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ آپکے ابتدائی جانشین بھی، جنکو تاریخ اسلام خلفاء راشدین کہتی ہے، اسی جامعیت کے حامل تھے۔ اسلام کے پروگرام کے ہر جزء پر ان کا پورا اعتقاد تھا، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اسکو اسکے پورے اجزاء کے ساتھ نافذ کرنے پر عازم تھے

اور انہوں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو صرف ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ متوازن ترقی ہوئی یعنی اخلاق و روحانیت کی بنیاد پر سیاست کا کاروبار چلایا گیا۔ عبادات سے فوجیں تیار کیں۔ دینداری کے اصولوں پر بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کے معاملات طے کیے گئے۔ خدا پرستی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر ٹیکس عائد کیے گئے اور پولیس اور جیل اور عدالت کا کام چلایا گیا۔ آسمانی ہدایات کے مطابق معاشی نظام قائم کیا گیا، اور اس طرح وہ دینی تمدن پیدا ہوا جو صرف اسی قسم کی حکومت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کامیابی اس پیشینگوئی کی تکمیل تھی جو قرآن نے ان الفاظ میں کی تھی کہ:

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج) یہ (مظلوم مہاجر) مسلمان وہ ہیں جنکو اگر ہم زمین میں با اقتدار کرینگے تو یہ نماز و زکوٰۃ کا نظام قائم کرینگے بھلائی کا حکم کرینگے اور برائی سے روکینگے۔

انکو اپنے زمانہ میں کوئی علٰحدہ مذہبی عہدہ دار یا شیخ الاسلام رکھنے کی ضرورت نہیں تھی اسلیے کہ ان میں سے ہر ایک مذہبی عہدہ دار اور شیخ الاسلام تھا۔ انکی مسجد کا امام جس طرح مذہبی منصب رکھتا تھا اسی طرح ان کا تحصیلدار، ان کا کوتوال، ان کا مجسٹریٹ، اور ان کا گورنر بھی مذہبی منصبدار ہی تھا۔

اسلام کا عہد زوال لیکن یہ عہد سعادت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ اسلام کی مسند حکومت پر وہ لوگ آئے جنکی دینی تربیت و تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسلام کے ساتھ اپنے اندر جاہلیت کا بھی معتد بہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں مسلمانوں کی زندگی کا نشو و نما غیر متوازن ہو گیا۔ مملکت کے حدود وسیع ہو گئے، سلطنت کا رقبہ بڑھ گیا، بیت المال (جو اب خزانۂ شاہی تھا) پہلے سے زیادہ معمور ہو گیا، دار السلطنت میں بڑی شاندار اور نوادر روزگار عمارتیں تعمیر ہو گئیں، پر شکوہ اور حسین مسجدیں، شاندار خانقاہیں اور وسیع مدارس بن گئے، تمدن انتہائی ترقی کر گیا، فنون لطیفہ اور علوم کو بیحد فروغ ہوا، یہ سب کچھ ہوا مگر اسلام کا اخلاقی اور دینی آئیڈیل ختم ہو گیا۔ اس آسمانی نظام تمدن و سیاست کی جگہ، جسکا قائم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا، انسانی نظام، افلاطون و ارسطو کے نظریات اور بازنطینی رومی

اور ایرانی نظام حکومت نے لی مذہب و نمائندگان مذہب کا اقتدار ختم ہو جانے سے ایک معزول بادشاہ کی طرح مذہب کا عملی زندگی اور سوسائیٹی پر کوئی اثر نہیں رہا اور اسکو اپنی جگہ زندگی کی کشمکش سے ہٹکر پرامن مسجدوں اور سنسان خانقاہوں میں ڈھونڈنی پڑی۔

مسلمانوں کی حکومت کے آخری عہد تک ہر سلطنت میں مشیر دینی قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام ہوتے تھے مگر انکی حیثیت بادشاہوں کے ملازمین کی سی تھی۔ زندگی کے دوسرے لوازم اور سلطنت کے دوسرے سامان آرائش کی طرح یہ عہدے بھی ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ان وابستگان حکومت میں سے بعض علماء حق ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا فریضہ ادا کیا اور سلطنت کو دین کی راہ پر لانے کی کوشش کی، چنانچہ تاریخ اسلام رجاء بن حیوۃ اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگوں کو نہیں بھول سکتی۔ اول الذکر نے سلیمان بن عبدالملک کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ولی عہدی کا مشورہ دیا جس سے زیادہ مبارک مشورہ اسلام میں کبھی کسی بادشاہ کو نہیں دیا گیا۔ اور قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو اسلامی مالیات خراج اور شرعی بندوبست کا دستور العمل لکھ کر دیا جو آج کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن ان سب کی حیثیت مشورے کی تھی۔ امر کی نہیں تھی۔ اور دنیا کی اصلاح امر سے ہوتی ہے نہ کہ مشوروں سے۔

دربار سے باہر علماء ربانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے اور ہمیشہ حکومت وقت کے غیر دینی رجحانات کا مقابلہ خارق عادت استقامت اور ثابت قدمی سے کرتے تھے۔ لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں اور غیر دینی حکومت کے جو بُرے اثرات سوسائیٹی پر پڑ رہے تھے انکو روک نہیں سکتی تھیں۔

ٹرکی میں مذہب و سیاست کی تفریق ہم مسلم ممالک میں سے ٹرکی کو انتخاب کرتے ہیں۔ اسلیے کہ وہ دنیائے اسلام میں مشرق و مغرب دور انکے متقابل رجحانات کی کشمکش کی سب سے بڑی جولانگاہ ہے اور مسلم ممالک اور سلطنتیں ٹرکی ذہنی قیادت قبول کر رہی ہیں۔ مصر، ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق اور شام کے نوجوان مسلمانوں میں تمامتر نوجوان ترکوں ہی کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔ امت میں سے ایک نے ہمت کر کے بے دانشی

کی ابتدا کر دی۔ اب اس قبیل کے سب لوگ اسی کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک تابناک مثال قائم ہو گئی۔

ہم پہلے دکھائینگے کہ سلطنت عثمانی میں علماء اسلام کی پہلے کیا حیثیت تھی اور کس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جن سے مذہب و سیاست کی تفریق ہوئی۔

عثمانیوں کا سیاسی مزاج مختلف اسلامی و غیر اسلامی اجزا سے مرکب تھا۔ ان کا نظام سلطنت دنیا کے مختلف ریاستی تجربات اور متفرق اصول حکومت پر مبنی تھا جسمیں اسلامی عدل و مساوات اور اسلامی پرسنل لا کے ساتھ بعض قدیم (یعنی ترکوں کے عہد جاہلیت کی) قومی خصوصیات، بازنطینی تنظیم، رومی سیاست اور افلاطون کی ریاست کے نظریات شامل تھے۔ سلطنت کے بنیادی عناصر میں سے ایک طبقہ علماء اسلام کا تھا جن کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا۔ خالدہ ادیب خانم اس طبقہ کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:-

"یہ ایک بہت قوی اور با اثر طبقہ تھا جسکی خاص تربیت ہوتی تھی۔ اس کا اصلی فرض یہ تھا کہ ملت اسلامی کے مذہبی اور قانونی معاملات کی نگرانی کرے۔ مگر اسکے علاوہ سلطان کے استبداد کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے وہ ایک اخلاقی قوت کا بھی کام دیتا تھا۔ صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جسے سلطان کے معزول کرنیکا اختیار تھا۔ بغیر اسکی منظوری کے کوئی نیا قانون نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ تمام ملتوں کی طرف سے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، سلطنت کے مقابلہ میں رعایا کے حقوق کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر جبری تبدیلی مذہب کی مخالفت کی۔"

یہ نظام قرون متوسطہ کے مسیحی نظام حکومت سے اصولاً متحد ہونے کے باوجود اس سے برتر اور اس سے زیادہ بے ضرر تھا۔ اس میں مختلف عناصر سلطنت کے حدود و اختیارات متعین تھے، کام کی تقسیم تھی، مذہب و سیاست کی تفریق سولہویں صدی کے بعد کے نظام حکومت سے کم لیکن اسکے پیشتر کے نظام سے زیادہ تھی۔

سترہویں صدی سے جب ترکی قوم کا زوال شروع ہوا تو علماء بھی اس عام قومی زوال سے محفوظ نہیں رہے
علماء کے زوال کی تاریخ کی دو فصلیں بہت اہم ہیں (۱) اخلاقی انحطاط (۲) علمی انحطاط۔

اخلاقی انحطاط کی تفصیل یہ ہے کہ علماء بعد کی صدیوں میں اپنے قدیم اخلاقی معیار اور اصول پر قائم نہیں رہے اور ارباب کلیسا کی طرح اپنے مذہبی اقتدار سے ذاتی منافع حاصل کرنے لگے۔ خالدہ خانم لکھتی ہیں :-

"سلطان کو معزول کرنے کا حق جو علماء کو حاصل تھا۔ ایک مستقل اخلاقی قوت کی حیثیت سے ظلم واستبداد کو روکنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنیکے لیے انہیں فوج سے اتحاد کرنا پڑا اور سیاسی امور میں دخل دینا پڑا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی جماعت اب ایک غیر جانبدار قانونی اور مذہبی جماعت نہیں رہی۔ مذہب بھی بساط سیاست کا ایک مہرہ بن کر رہ گیا"

علمی انحطاط :- ترکی میں علماء کی ذمہ داریاں تمام مسلم ممالک کے علماء سے زیادہ نازک تھیں اسکے کئی اسباب تھے۔ اول یہ کہ وہ یورپ میں تھے جو علوم وفنون کے طلوع ہونے والے آفتاب کا مشرق تھا اور جہاں (اقبال کی زبان میں) "تاروں کی گردش تیز اور ہر ذرہ کے دل میں غوغائے رستاخیز تھا"
دوسرے انکا مقابلہ ان اقوام سے تھا جنہوں نے اختراعات وانکشافات کی نئی دنیا دریافت کرلی تھی، جو قوائے طبیعیہ کی تسخیر اور اسرار فطرت کی نقاب کشائی اور دنیا کی ہونے والی سیاسی واقتصادی وذہنی جنگ کیلیے نئے نئے اسلحہ دریافت کر رہی تھیں اور قلعے تعمیر کر رہی تھیں۔

تیسرے یہ وہ زمانہ تھا جسکا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر تھا جس میں قوموں کی قسمتیں لکھی جارہی تھیں اور دنیا کا آئندہ نقشہ تیار کیا جارہا تھا۔

ناممکن تھا کہ اس عام تلاطم کے زمانہ میں ترکی کے بحر خاموش میں تموج نہ پیدا ہوتا۔ اس حالت میں

علمار کا فرض تھا کہ زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے، اسکے سینہ کی دھڑکن کو دیکھتے، اور صرف یہی نہیں بلکہ زمانہ کی رہنمائی کے قابل بننے کی کوشش کرتے، نئے رجحانات اور تقاضوں کی نگرانی کرتے، صحیح تقاضوں کو پورا کرتے اور غلط تقاضوں کو روکنے اور درست کرنے کی طاقت پیدا کرتے، نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرتے کہ وہ علمی و فنی ترقی میں مغربی قوموں کے ہمدوش بھی ہوتے اور پھر مسلمان بھی رہتے نیز اسلامی تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی ثقافت کی برتری ثابت کرتے اور انکو اسلامی رنگ میں کم سے کم اتنا رنگ دیتے کہ انکے ہاتھوں سے سیاست و تمدن میں جو انقلاب ہوتا وہ سراپا غیر اسلامی نہوتا۔ اس غرض کے لیے علمار کو اپنے قدیم طرز تعلیم و نظام ترمیم پر نظر ثانی کرنی چاہیے تھی اور جدید علمی بیداری کا نہ صرف ساتھ دینا چاہیے تھا بلکہ مسلم ہونے کی حیثیت سے اسکی پیشوائی کرنی چاہیے تھی۔ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ انقلاب کو روکنے کی کوشش نادانی ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ اس کا رخ پھیر دیا جائے اور اسکو مفید یا کم سے کم بے ضرر بنانے کی سعی کی جائے۔

نہ صرف ٹرکی بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ اس دور میں جو لوگ علم دین کے حامل تھے وہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا تو کیا کرتے، سمجھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ اسکی تفصیل خالدہ ادیب خانم کی زبان سے سنیے:۔

> "ملت اسلامی کی تعلیم انہی علمار کے ہاتھ میں تھی۔ جبتک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسہ سلیمانیہ۔ اور مدرسہ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مگر جب مغرب نے کلامیات کی زنجیروں کو توڑ کر نئی علم و حکمت کی بنیاد ڈالی جسنے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علمار کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اتنک آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرز خیال

انیسویں صدی کے وسط تک انکے نظام تعلیم پر حاوی رہا۔ انہوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ انکے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے نتیجہ یہ ہوا کہ انکے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ ادھر دور انحطاط میں انکی سیاسی مصروفیتیں اسقدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدے اور تجربے کے جھمیلے میں پڑنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔ سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں۔ چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔"

"۱۸۶۰ء سے حکومت نے ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیے جنمیں جدید نصاب رائج تھا مگر انکی تعداد بہت کم تھی۔ طلبہ کی کثیر تعداد بدستور مسجدوں کے مکاتیب میں پڑھتی رہی اور اس وجہ سے عام لوگوں کی تعلیم پر وہی جمود طاری رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر جو کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں وہ بجائے اسکے کہ صحیح ارتقا اور نشو و نما کا نتیجہ ہوتیں، حکمران طبقہ کی طرف سے زبردستی عائد کی گئیں، انکی نافذ کرنے والی عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو علماء کو نہ صرف تعلیم سے بے دخل کرنا چاہتی تھی بلکہ انکی اخلاقی اور روحانی حکومت کی بیخ کنی کے درپے تھی۔"

نوجوانوں کی مذہب سے بیزاری اور بدگمانی کے وجوہ میں ایک بڑی وجہ اُن سلاطین کا جبر و تشدد، جمود، توہم، اور سوء ظن تھا جو خلیفۃ المسلمین کہلاتے تھے اور نائب رسول و حامی اسلام سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً خلافت کے سب سے بڑے مدعی و مبلغ سلطان عبد الحمید خان کے سلوک و رویہ نے نوجوان ترکوں کو اور زیادہ مشتعل اور زخم خوردہ بنا دیا۔ ٹرکی کے ان پچھلے سلاطین نے سلطنت عثمانیہ میں قرون متوسطہ کے با اقتدار ارباب کلیسا کا پارٹ ادا کیا اور مذہب کی انتہائی غلط نمائندگی کی۔

ان تمام اسباب کے باوجود نوجوان ترک بہرحال اپنی غلطیوں کی ذمہ داری سے بری نہیں ٹھیرائے جا سکتے۔ جب انہوں نے

خود حکومت کا بار اٹھایا تھا تو انہیں اپنے فرائض سے بھی واقف ہونا چاہیے تھا - ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ لٹھ لیکر آبائی زمین کو بچانے کی کوشش کرتے، بلکہ اسکے ساتھ انکو سنجیدہ مفکر بھی بننا چاہیے تھا اسلیے کہ ان پر حیاتِ نو کی تعمیرِ جدید کا بار بھی آپڑا تھا - انکو دین اور نمائندگانِ دین میں امتیاز کرنا چاہیے تھا - انہوں نے جہاں جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین اور یورپ کے علومِ عمرانیہ کا مطالعہ کیا تھا انکا فرض تھا کہ قرآن و حدیث کا بھی مطالعہ کرتے - لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اس حیثیت سے نہایت پست درجہ کے نکلے - واقعہ یہ ہے کہ انقلابِ ترکی کے آخری ایام موت و حیات کی کشمکش، قومی مصائب، اور میدانِ جنگ کی مصروفیات کے ایسے ایام تھے جن میں ترک جیسی برسرِ انحطاط قوم کے لیے اپنا دماغی توازن قائم رکھنا مشکل تھا - جن لوگوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت ان غیر متوازن حالات میں ہوئی انکی تربیت نہایت ناہموار ہوئی - یہ تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے خام، اخلاق و خصائل کے لحاظ سے ادھکچرے اور علمی و ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے - انتہا پسند، کم غور کرنے والے، جلد باز، سطحی النظر، خام کار، اور ہر میدان میں یورپ سے شکست خوردہ، یہ تھا ان کا عقلی مزاج - اور بدقسمتی سے ترکی جدید کی تعمیر کا سارا کام بالکل انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا کیونکہ کوئی دوسری بہتر درجہ کی جماعت اتنی منظم اور طاقت ور موجود نہ تھی جو اسکو اپنے ہاتھ میں لیتی - خالدہ ادیب، جو خود انجمن اتحاد و ترقی کی رکن رہ چکی ہیں، اور جنہوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی ایک اچھی خاصی مدت تک ترکی جدید کے معماروں کے ساتھ کام کیا ہے، صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں :-

> "اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے - ابتداء میں ان کے اندر ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لیکر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے - مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے - ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنیکے لیے سب کچھ کر گذرتے ہیں - اسلیے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل و ذرائع بے تکلف اختیار کر لیتے تھے"

(باقی)

مقالات

ایک نہایت اہم اِستفتاءٔ

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتاء بھیجا ہے جس کا موضوع بجائے خود نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے اسکی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر علماء اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ذیل میں استفتاء اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے:

" ماہرین علوم اسلامیہ و مفتیان شرع متین سے حسب ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے:

(۱) اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ مسلمان مرد و عورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کردے، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہوجانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دیدے جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نکاح فسخ ہو جائیگا اور عورت پر طلاق واقع ہوجائیگی اور عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہوجائیگا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور ایقاع طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کرسکتی ہے؟

(۲) اگر سوال مذکورۃ الصدر کا جواب نفی میں ہو یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم فسخ نکاح اور ایقاع طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور غیر مسلم کے فسخ نکاح یا ایقاع طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اول کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کریگی، اور اس دوسرے مرد

کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے ذریعہ سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہو گا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زن و شو کا تعلق رکھنا حرام ہو گا یا نہیں؟ اور وہ دونوں شرعاً زنا کے مرتکب سمجھے جائینگے یا نہیں؟

(۳) اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہوگی تو وہ ولد الحرام ہوگی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہوگی یا نہیں۔

مہربانی فرماکر ان سوالوں کے جواب نمبر وار مدلل تحریر فرمائیے" الخ

المستفتی محمد وحید الدین قاسمی حال مقیم دفتر جمعیت علماء ہند۔ گلی قاسم جان۔ دہلی

اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں اسکو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف فسخ و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان معاملات کی نوعیت دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رو سے غیر مسلّم ہے۔ اسلام نہ اُس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک، یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ و خود مختارانہ قائم ہوئی ہو، نہ اس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اُس عدالت کے حق سماعت و فصل خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اسکی اجازت (Sanction) کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کرلی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رو سے اُن عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔ ان عدالتوں کے جج، اُن کے کارندے اور وکیل اور ان سے

فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو پادشاہ ارض وسما کی مملکت میں اُس کے "سلطان" (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو اور جس میں اُسکے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ ایسا نظام عدالت جرم مجسّم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے فریقین مجرم ہیں، اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے کیونکہ بغاوت اسکی جڑ میں موجود ہے۔ بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور، زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہونگے، اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہونگی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کیے جو خدا کے قانون کی رو سے ان کو حاصل نہ تھے۔

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے جبکہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان انکی کرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لیکر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے احکام جاری کرتا ہے وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھلا اُس کے احکام کالعدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جبکہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں۔ خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں قلیل التعداد ہوں یا کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری اصول پر نظام حکومت قائم کیا ہو، بہرحال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر

ہوکہ اہل ملک خود مالک الملک (Sovereign people) ہیں اور ان کو خود اپنے لیے "قانون بنانے" کا اختیار حاصل ہے، اُس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی پادشاہ کی رعیت اُسکے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اُسکے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کرے جس طرح ایسی حکومت کو اُس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کرسکتا اُسی طرح اس نوع کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہونگی، خواہ انکے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم انکے فیصلے بھی اسی طرح کالعدم ہونگے جس طرح کہ صورت اول و دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسکی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم چونکہ سائل نے کتاب و سنت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے اسلیے محض چند آیات قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے لہذا فطرۃً امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اسکے مُلک (Dominion) میں، اُسکی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	کہو اے اللہ، مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے
مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران ۳)	اور جس سے چاہے چھین لے۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر - ۲)	وہ ہے اللہ، تمہارا رب، مُلک اسی کا ہے۔
لَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (بنی اسرائیل -۱۲)	پادشاہی میں کوئی اس کا شریک (partner) نہیں ہے۔
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (المومن - ۲)	لہذا حکم اللہ بزرگ برتر ہی کے لیے خاص ہے۔
وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (الکہف -۳)	اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصہ دار نہیں بناتا۔
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (اعراف - ۷)	خبردار! خلق اُسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا ہے۔
يقولون هل لنا من الامر من شئ	لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں، ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہدو کہ

قل ان الامر کلہ للہ (آل عمران - ۱۶) امر سارا کا سارا اللہ کے لیے مخصوص ہے -

(۲) اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکلیہ سلب کرلیا گیا ہے، کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، . . . . . . اور رعیت کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہو- اُسکے قانون کو چھوڑکر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کرکے اسکے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ طاغوت (باغی اور خارج از اطاعتِ حق) ہے، اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اسکے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ (النحل - ۱۵)

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو انکے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہدیا کرو کہ یہ حلال lawful اور یہ حرام (unlawful) ہے -

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف - ۱)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اُسکے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھیرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو -

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ - ۷)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں -

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (النساء - ۹)

اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اُس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)-

(۳) خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور صحیح عدالت صرف وہ ہے جو اُس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے - اسی کا نام خلافت ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۹)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے -

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء - ۱۶)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے -

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ..... اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (المائدہ - ۷)

اور یہ کہ تم اُنکے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور اُنکی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کرکے اس ہدایت کے کسی جزو سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے ..... کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص - ۲)

اے داؤد! ہم نے تمکو خلیفہ مقرر کیا ہے لہذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکا لے جائیگی -

(۴) اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو بلا لحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں باہم کتنی ہی مختلف ہوں - اُن کے تمام افعال بے اصل، بے وزن، اور باطل ہیں -

ان کے حکم اور فیصلہ کے لیے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان (charter) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں، خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم ہے۔ اہلِ ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) اُنکے وجود کو بطور ایک خارجی واقعے (de facto) تسلیم کر سکتے ہیں، مگر بطور ایک جائز وسیلۂ انتظام و فصل قضایا کے (de jure) تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا (اللہ) کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے۔ اور جو ایسا کریں وہ ادعائے اسلام وایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعایا پر باغیوں کے اقتدار کو جائز رکھے اور اسے ان کا حکم ماننے کی اجازت دے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف ۱۲)

اے نبی! ان سے کہو، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود، رضائے الٰہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی)، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اسکی ملاقات (یعنی اسکے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اسلیے ان کے سب اعمال حبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دینگے۔

تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہود - ۵)

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اسکے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمنِ حق کے امر کا اتباع کیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَائِہٖ فَاتَّبَعُوْا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (ہود-۹)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح و روشن سلطان کے ساتھ فرعون اور اسکے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگران لوگوں نے (ہمارے فرستادہ شخص کے بجائے) فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا)۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (الکہف-۴)

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جسکے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اسکے رب ہیں) غافل پایا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جس کا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا (اعراف-۴)

اے نبی کہدو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے، اور معصیت کو، اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت یا الوہیت میں) اُن کو شریک کرو جن کے لیے اللہ نے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلَّا اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَا اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ (یوسف-۵)

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جنکی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ بجا لاؤ۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء-۱۸)

اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے درانحالیکہ راہ راست اسکو دکھا دی گئی، اور ایمان داروں کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم اسی طرف چلائینگے جدھر وہ خود مڑ گیا اور اسے جہنم میں جھونکینگے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء - ۹)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہونگے جب تک کہ اے نبی! تجھ کو اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا تسلیم کریں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (النساء - ۹)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے جھجک رہے ہیں۔

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (النساء - ۲۰)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کے لیے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے۔ اسلام کے نظام فکر، نظام اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر متشابہ رہ جاتا تو قرآن کا نزول ہی معاذ اللہ بے کار ہوتا۔ اسلیے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور قطعی طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔

پھر جبکہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لیے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے، اور اللہ کے سلطان سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اسکی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اُس معاملہ میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اسکے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اسکے ناخن یا اسکے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ خنزیر جب پورا کا پورا حرام ہے تو اسکی کسی خاص بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں؟ پس یہ سوال کرنا کہ فسخ نکاح اور تفریق بین الزوجین اور ایقاع طلاق کے بارے میں غیر الٰہی عدالتوں کا فیصلہ

نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا جائے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظام عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں اُن کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا۔ حالانکہ خنزیر کے جسم کی کسی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لیے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے، یا بالفاظ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے؛ البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں ارتداد سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام کو چھوڑ کر کسی آسان طریقِ زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا ہی چاہتے ہیں تو ان کے لیے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔

اِسلام اور اِشتراکیت

(۲)

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب جمانپور

اسلامی نظام معیشت کے محاسن | اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے ہمارا یہ دعویٰ اظہر من الشمس ہو جائیگا کہ اپنے محاسن کے اعتبار سے اسکو اشتراکیت پر بدرجہا فضیلت حاصل ہے۔

اسلام نے قانون کو دولت کا مالک قرار دے کر حکومت اور پبلک کے درمیان کشمکش و تصادم کے اسباب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اسکی وجہ سے پبلک اور حکومت کے درمیان تعاون کی روح پیدا ہو جاتی ہے پبلک کا ہر فرد حکومت کا ایک رکن بنکر اسلام کے اقتصادی و سیاسی پروگرام کو چلانے میں حصہ لیتا ہے۔ ہر ایک کے حقوق اور حدود قانون میں محفوظ ہونے کی وجہ سے کسی کو اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں بے اطمینانی نہیں رہتی۔ اس طرح افراد کی ذاتی استعدادیں پوری طرح نشوونما پاتی ہیں، پھر یہ ترقی یافتہ استعدادیں جماعتی فلاح کے کام آتی ہیں، اور ہر آنے والی نسل پچھلی نسل سے زیادہ استعداد، ذہانت اور قابلیت رکھنے والی اٹھتی ہے۔ خود اعتمادی جو ہر قسم کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے، اُن میں نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ ترقی کرتی رہتی ہے۔ اسلام کے اقتصادی ضوابط چونکہ اسکے اخلاقی ضوابط کے ساتھ مربوط ہیں اسلیے ان پر عمل پیرا ہونے سے افراد و جماعت دونوں کی اخلاقی حالت بھی روز بروز سدھرتی چلی جاتی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے وہ جراثیم قطعاً فنا ہو جاتے ہیں جو قارونیت پیدا کرنے والے ہیں۔

انسان کو کسی برائی سے روکنے کا فطری طریقہ یہی ہے کہ اسکی طرف سے طبیعت انسانی کے رجحان کو ہٹادیا جائے - جب تک اس رجحان کو نہ ہٹایا جائیگا محض خارجی اور مصنوعی تدابیر سے وہ برائی عارضی طور پر دبائی تو جاسکتی ہے مگر فنا نہیں کی جاسکتی - اسکو دبانے کے لیے ہم کتنا ہی مضبوط نظام کیوں نہ بنائیں وہ ایک نہ ایک دن اسکو توڑ کر ضرور ظاہر ہو جائیگی - اس لیے کسی نظام کے بقا کی واحد صورت یہ ہے کہ اسکو چلانے کے لیے مناسب اشخاص تیار کیے جائیں - اسلام نے یہی کیا ہے - وہ جس اقتصادی نظام کی تعلیم دیتا ہے اسکا تعلق اپنے ذہنی و اخلاقی نظام کے ساتھ قائم کر کے ایک ایسی فضا تیار کر دیتا ہے جس میں اسی نظام کی طرف رجحان رکھنے والے اور اسکو چلانے کی استعداد رکھنے والے اشخاص تیار ہوتے رہتے ہیں - انکی ذہنیت اور فطرت ہی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ بغیر جبر و اکراہ کے خود بخود اسی نظام کے خواہشمند ہوتے ہیں - اشتراکیت کی طرح اسکے لیے کسی جبر و استبداد یا حکومت کی سخت گیری کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ اس فضا میں ظالمانہ سرمایہ داری خود بخود ابدالآباد کیلیے موت کی نیند سو جاتی ہے -

سرمایہ کی ملک کے مسئلہ کو اسلام نے جس صورت سے حل کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے - اشتراکیت کی طرح وہ حکومت کو ایک بڑا سرمایہ دار بنا کر شخصی سرمایہ داری کے بجائے جماعتی سرمایہ داری کو رائج نہیں کرتا بلکہ حکومت اور افراد دونوں سے سرمایہ کا حق چھین کر سرے سے وہ قارونیت ہی کو نیست و نابود کر دیتا ہے -

دماغ کی قدر و قیمت اسکے نزدیک دیگر اعضاء سے زائد ہے مگر نہ اتنی زائد کہ قارونیت و سرمایہ داری کا وجود ہو سکے - اسکے لیے یہ اصول ہے کہ دماغی کام کرنے والوں کے تھوڑے وقت کی بھی اتنی ہی قیمت لگائی جائیگی جتنی جسمانی کام کرنے والوں کے زائد وقت کی - یہ زیادتی اور کمی کام کی افادیت کے لحاظ سے ہوگی - لیکن اتنی ہرگز نہ ہوگی کہ معاشی توازن کو خراب کر کے اسلامی نظام معیشت کے مقصد ہی کو فوت کر دے -

علاوہ بریں اسلام کا اقتصادی نظام مضبوط اخلاقی پس منظر رکھنے کی وجہ سے افراد انسانی کے درمیان ایک ایسی عالمگیر اخوت و برادری کی بنیاد ڈالتا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اشتراکیت کی طرح وہ طبقاتی نزاع کی آگ نہیں بھڑکاتا بلکہ ہمدردی، تعاون اور رفاقت کی ذہنی و عملی روح پیدا کرکے سوسائیٹی کے تمام اجزا کو یک جان بنا دیتا ہے۔

اس دور میں جبکہ ہندوستان ایک عظیم الشان انقلاب کے لیے تیار ہو رہا ہے، جس کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنا ناگزیر ہے، خصوصاً ہماری معاشی زندگی اس انقلاب سے سب سے زیادہ متأثر ہونے والی ہے، کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس انقلاب کا رخ اسلامی راستوں کی جانب پھیر دیں اور اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کو ملک میں رائج کرنے کی پوری پوری جدوجہد کریں؟ لیکن ہماری حالت بیحد افسوسناک ہے۔ ہمارا خالص نئی روشنی سے متأثر نوجوان طبقہ تو اشتراکیت کی طرف دوڑ رہا ہے اور اسلام کو اس نے محض چند عقائد اور چند عبادات کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ اسلام ہے کیا چیز اس لیے وہ اقتصادیات و سیاسیات کے لیے غیروں کے آگے دریوزہ گری کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے علم دین رکھنے والے ان لوگوں پر جو اپنی پوری قوت یہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ اور مزید حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس روش کو مسلمانوں کے لیے اور ملک کے لیے مفید بھی سمجھ رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں جو نقصانات ہیں ان سے وہ دونوں کو محفوظ بھی رکھ سکیں گے۔

جمعیتہ العلماء کے ایک معزز رکن کا ایک بیان اخبارات میں اشتراکیت کے متعلق پڑھا تھا جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "اشتراکیت کا تعلق جہاں تک محض اقتصادیات سے ہے وہ عین اسلام ہے لیکن مادیت کا عنصر اس میں غیر اسلامی ہے جس کا نکال دینا ضروری ہے" (روایت بالمعنی ہے)

مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رکن نے بھی جن کے اخلاص اور دینداری کی تعریف کانگریسی مسلمان بھی کرتے ہیں ایک روز راقم الحروف سے انہیں خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ زمانہ کا اثر ہے جس نے فراست

ایمانی کی نعمت ہم سے چھین لی ہے۔ ورنہ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اشتراکیت تو سراپا مادیت ہے اس سے مادیت کو جدا کر کے یا اس میں روحانیت کا کوئی جزو شامل کر کے اسکو باقی کہاں رکھا جاسکتا ہے؟۔

ان حضرات سے مجھے ایک بات اور کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جنگ نظریات و افکار کی ہوتی ہے شکست خوردہ وہ ہے جو اپنے افکار و نظریات کو دوسرے کے افکار میں جذب کر دے اور فاتح وہ ہے جسکے افکار غالب ہوں کسی غیر اسلامی نظریہ کو اختیار کر کے آپکی اسلامی زندگی کا بقا نا ممکن و محال ہے۔ اسلام ایک خاص نظریۂ حیات ہی کا نام ہے۔ اسے چھوڑ کر آپ مسلمان رہتے ہی کہاں ہیں کہ غیر اسلامی نظریہ میں مسلمانوں کی بھلائی ڈھونڈنے چلے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف حدیث نبوی "من تشبہ بقوم فھو منھم" اشارہ کر رہی ہے۔ کیا اس حدیث کا مفہوم صرف ہیٹ اور پتلون ہی تک محدود ہے اور سوشلسٹ یا کمیونسٹ بننے سے مانع نہیں ہے؟

ہندوستان کا مسئلہ سطور سابقہ میں ہم نے اسلام کے اقتصادی اصول اور اشتراکیت میں موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام اشتراکیت سے بمراتب افضل و برتر ہے اسلیے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ الٹ کر اشتراکیت کے بجائے اسکو رائج کرنا چاہیے تاکہ امن و فلاح کی فضا میں انسانیت ترقی کر سکے۔ ذیل میں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام کے اقتصادی نظام کو رائج کرنے کی کیا شکل ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا اشکال ہندوستان میں مختلف اقوام و ملل کی موجودگی کا پیش کیا جاتا ہے۔ مگر یہ اشکال کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ جہانتک اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا تعلق ہے کوئی مذہب زندگی کا کوئی مکمل نظام پیش ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا ہر مذہب انسان کی انفرادی زندگی سے ہی تعلق رکھتا ہے اور محض چند عقائد اور چند عبادات کے مجموعہ سے عبارت ہوتا ہے۔ اسلیے اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا کوئی اقتصادی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جس کا تصادم

اسلامی نظام معاشی سے ہو سکے۔

علاوہ بریں مسلمانوں کے سوا دوسری قوموں کے لیے اقتصادیات کے مسائل محض دنیاوی ہیں اسلیے انکے نزدیک اسلامی نظام اور اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ انکے نزدیک دنیا و دین دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ مزید براں انکو جس اقتصادی نظام کی تعلیم دی گئی ہے وہ اشتراکیت اور دنیا کے ہر اقتصادی نظام سے کہیں اعلیٰ و برتر ہے پھر وہ اشتراکیت یا اور کسی اقتصادی نظریہ کو کیوں قبول کریں؟ اسلیے کسی دوسرے اقتصادی نظام کے رواج پر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو صرف مسلمانوں کو ہو سکتا ہے۔ انکے علاوہ کسی دوسری قوم کو مذہبی حیثیت سے کسی مناسب معاشی نظام پر اعتراض کرنیکی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی خواہ وہ نظام اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔

دقت جو کچھ ہے وہ درحقیقت غلط فہمی بلکہ نافہمی کی بنا پر ہے جس کا آسان علاج یہی ہے کہ اسلامی اصول معاشی اور انکی افادی حیثیت کی وضاحت و تبلیغ عوام و خواص میں کی جائے (خصوصاً مزدوروں و کسانوں میں) اس قسم کی معمولی سی تبلیغ بھی انشاء اللہ بہت کارگر ہوگی اور ان دقتوں کو بہت جلد رفع کر دیگی۔

اس مشکل سے قطع نظر کرنیکے بعد ہندوستان میں اسلامی نظام اقتصادی کی ترویج میں کوئی مانع نہیں رہجاتا۔ سوال فقط اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ موجودہ معاشی قوانین میں کیا تبدیلیاں کی جائیں؟ یا بالفاظ دیگر ان قوانین کو منسوخ کر کے کون سے معاشی قوانین کو رواج دیا جائے؟ یہ مبحث خود ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے اور انشاء اللہ اس پر کسی آئندہ فرصت میں تفصیل کیساتھ لکھونگا۔ یہاں مختصراً ان چند اصول کو ذکر کرتا ہوں جنکو ہندوستان میں رائج کرنے سے ملک میں ایک عجیب معاشی انقلاب رونما ہوگا اور فلاح و خوشحالی کا دور دورہ ہو کر ہندوستان صحیح معنی میں جنت نشان ہو جائیگا۔ وہ اصول درج ذیل ہیں:۔

(۱) شرعی محاصل مثلاً زکوٰۃ، عشر، وغیرہ مالکان نصاب سے وصول کر کے غرباء کو تقسیم کیے جائیں۔

(۲) شرعی قانون وراثت جاری کر کے رفتہ رفتہ تعلقہ داری و زمینداری سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

(۳) وسائل پیدائش (means of production) میں زمین اور محنت ہی کو اصل قرار دیا جائے اور سرمایہ کو صرف ضمنی عامل مانا جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں کل سودی کاروبار بند کر دیئے جائیں۔ واضح ہو کہ "سود" سے ہماری مراد شریعت اسلامیہ کا اصطلاحی سود ہے۔ موجودہ علم المعیشت کی اصطلاح مراد نہیں ہے۔

(۴) قمار کے کل انواع مثلاً لاٹری، سٹہ (Speculation) وغیرہ ممنوع ہوں۔

(۵) سرمایہ لگانے (Investment) کی صرف دو صورتیں روا رکھی جائیں۔ ایک شخصی تجارت۔ دوسرے مضاربت[۱]۔ اور یہ حکومت کے زیر نگرانی اسلامی قوانین کے ماتحت ہوں۔

(۶) احتیاج عامہ کی چیزوں میں احتکار[۲] سختی کے ساتھ روکا جائے۔

(۷) جن چیزوں کی تجارت شریعت اسلامیہ میں ممنوع ہے ان کی تجارت قطعاً بند کر دی جائے۔ مثلاً شراب وغیرہ کی تجارت قطعاً روک دی جائے۔

(۸) اجارہ داری کو بند کیا جائے۔

(۹) نقد روپیہ چھپا کر جمع کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔

(۱۰) زمیندار کی دو حیثیتیں ہیں۔ ناظم عاملین پیدائش۔ اور محصل (Rent-collector) اس کی پہلی حیثیت برائے نام ہے اس لیے محض محصل ہونے کی حیثیت سے اس کو معمولی شرح سے کمیشن دیا جائے۔

(۱۱) مزدور کے مندرجہ ذیل حقوق آجر (employer) پر ثابت مانے جائیں:
حفاظت جان و تندرستی، فرائض مذہبی کی ادائیگی میں سہولت، اخلاق حسنہ کا قیام و بقاء، ضروری تعلیم

---

[۱] دو فریقوں کے درمیان یہ معاملہ کہ سرمایہ ایک فریق کا ہو اور محنت دوسرا فریق کرے اور نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں۔

[۲] اشیاء کے ذخائر کو روک کر رکھنا تاکہ گراں قیمتوں پر فروخت کیا جا سکے۔

کارگاہ تنگ آمد و رفت میں سہولت، خطرات کار سے حفاظت، ناکارہ ہوجانے کی صورت میں گذارہ، رخصت اور تعطیل کے مناسب حقوق، اوقات کار کا مناسب حد کے اندر رہنا، اجرتوں کا منصفانہ ہونا۔

یہ تجاویز انشاء اللہ بہت جلد معاشیات ہند میں امکانی مساوات پیدا کردینگی۔ انکے علاوہ اسلامی اصول کے ماتحت ایک تعمیری اسکیم بھی بنائی جاسکتی ہے جسکی تفصیلات کے لیے ایک علحدہ مضمون درکار ہے۔

ہندوستان کے معاشی نظام میں یہ اصولی تبدیلیاں کسی خاص قوم کے ہی لیے نہیں بلکہ جملہ اقوام و ملل ہند کے لیے یکساں مفید ہونگی۔ اسلامی نظام حیات کی ترویج کے لیے موجودہ دور سے زیادہ مناسب دور شاید ہی کبھی تاریخ عالم میں آیا ہو۔ اسوقت دنیا غیر اسلامی نظامہائے زندگی سے خود تنگ آچکی ہے اور ایسے نظام حیات کی تلاش و جستجو میں ہے جو اسکو سکون و راحت سے ہم آغوش کردے اور یہ چیز محض اسلام میں مل سکتی ہے۔ اس معرکہ کو سر کرنے کے لیے اولین ذریعہ تبلیغ ہے۔ کاش مسلمان اس طرف توجہ کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم خود اپنے اصول زندگی کو چھوڑ کر غیر اسلامی نظریات کو قبول کررہے ہیں اور انکی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ کبھی ہم اشتراکیت کی طرف جاتے ہیں تو کبھی اشتمالیت کی جانب، کبھی نازیت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کبھی جمہوریت کی سڑی ہوئی لاش کو اکھاڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب چیزیں حقیقت میں ایک ہی ہیں محض صورتیں مختلف ہیں۔ اور یہ دنیا کو امن و سکون سے کبھی آشنا نہیں کرسکتیں۔

ایک بہت بڑا مغالطہ اس مقام پر یہ ہوتا ہے، اور یہ مغالطہ زیادہ تر علماء کو ہوتا ہے کہ اشتراکیت اسلام کے مخالف نہیں ہے۔ اول اس دعویٰ کی صداقت ہی میں کلام ہے۔ لیکن اسکو تسلیم کرلینے سے بھی "مسلم اشتراکی" کا لفظ بدستور بے معنی رہتا ہے "مختلف" اور "مخالف" دو لفظ ہیں جنکے معانی کا اختلاف واضح ہے کسی اصول زندگی کے غیر اسلامی اور ناقابل قبول ہونے کیلیے یہی ضروری نہیں کہ وہ اسلامی اصول کے "مخالف" ہو بلکہ اسکے لیے محض "اختلاف" بھی کافی ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو کل نظامہائے زندگی کیلیے ناسخ ہے۔ اسکے معنی یہی ہیں کہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی نظام ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے اور ہماری "چشم یک بیں" کو کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی روا نہیں ہے۔

تین مدارس فکر

از جناب محمد زبیر صاحب برآنر ایم - اے

صلاح و فساد کی بحث کے بعد ہماری راہِ سفر جس گھاٹی میں پہنچ گئی ہے وہ کانٹ (Kant) کے عقائد سے مرتب ہے۔ اس مرحلہ پر ہمیں اسکے پیچ و خم سے گذرنا ہے۔ ذیل کے تین مدارس فکر اب ہمارے سامنے ہیں:۔

۱- ہوبز (Hobbes) اپیکیورس (Epicurus) اور افادیت کے علمبردار۔

۲- کانٹ اور اسکے ہم خیال مفکرین فشتے (fichte) وغیرہ۔

۳- شلائیر میچر (Schleiermacher) اور جینٹ (Janet)

ان علما کو اگر کسی ایک مجلس میں بلایا جاسکتا تو انکی بحث کچھ اس نوعیت کی ہوتی:

اپیکیورس اور ہوبز:۔ زیادہ سے زیادہ خوشی کو کم سے کم تکلیف کے ساتھ حاصل کرنا زندگی کا مقصد ہے۔

کانٹ:۔ حصول مسرت کے لیے جینا یا تو رہبانیت ہے یا بربریت۔ نیکی یا اچھائی کا جینا نہیں۔

اپیکیورس:۔ انسان کے اخلاق کی جڑیں اسکی اپنی فطرت میں ہیں۔ انسان فطرۃً خوشی کو تلاش کرتا اور غم سے بھاگتا ہے۔ انسان کو اپنے اندر کی روشنی سے چلنا ہے۔ (گذشتہ اشاعت میں اسکی تفصیلات گذر چکی ہیں)

کانٹ:۔ انسان کی فطرت اُسے تاریکیوں کی جانب لے جائیگی۔ اُسے اس پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ بھلائی اور برائی یا نیکی اور بدی کا ایک ضابطہ (Law) خارج میں موجود ہے (معروضیت)۔ یہ افراد

سکے ردوقبول سے بالاتر ہے - ہر فرد بشر کے لیے ثابت و قائم ہے - ہر ایک کے جذبات سے بے نیاز ہے - اسی پر پورا اترنا بھلائی ہے، خواہ رنج اٹھانا اور دکھ سہنا پڑے - انسان کے لیے یہ فرائض ایک عالمگیر شکل رکھتے ہیں -

تمہیں مسرت طلبی کے طوفانی جذبات نے بلایا ہے - اپیکیورس کا مشورہ یہ ہے کہ خوشی کے تعاقب میں دوڑ جاؤ - کانٹ نے طاق سے دستور کو اتار کر اسکے اوراق الٹے اور پڑھا: زنا نہ کر - چوری نہ کر - شراب نہ پی - تم نے پوچھا: کیوں؟ کانٹ نے کہا: اسلیے کہ ضابطہ یہی کہتا ہے - یہ بنا بنایا موجود ہے - تم نے چھڑی ہاتھ سے رکھدی - بیٹھ گئے اور پوچھا اس کا مصنف کون ہے؟ میری زندگی کے لیے ضابطہ بنانے کا اقتدار اسے کس بنیاد پر حاصل ہوا؟ میں کیوں اپنی ایک خواہش پوری نہ کروں؟ میں کیوں اس طوفانی رات میں مجبور ہوں کہ ایفائے عہد کے لیے سمندر کی موجوں سے ٹکرا جاؤں؟

کانٹ جواب دیتا ہے: - بس! یہ مقرر دستور ہے معروف عام اور عالمگیر ہے - اسکے مظاہر سے اس کا وجود ثابت ہے اور وہ سب اسکی عالمگیری میں ہیں - اسکی اطاعت لازمی اور ناگزیر ہے - اخلاق کی نگاہ میں نیک یا پسندیدہ افعال صرف وہ ہیں جو اسکی ناگزیریت (Obligation) کے پیش نظر وجود میں آئیں - اخلاق کا حکم یہی ہے اور تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا - انجام کی تلخیاں ان اخلاقی بلندیوں کے حصول کی خاطر تمہیں گوارا کرنی ہونگی - یہ ایک عالمگیر قانون اخلاق ہے - اسکے عواقب سے بے نیاز ہو کر اسکی فرمانبرداری خود اسکے اپنے لیے شرط اخلاق ہے - یہ سودمندیوں کی تلاش اور منافع کی آرزو سے بالاتر ہے - اس ضابطہ کی اطاعت انسانیت کا فرض اولین ہے - نیکی صرف وہ ہے جو اس فرض انسانی یا ضابطہ میں ہو - یہ کہنا کہ فلاں فعل نیک ہے اسلیے ضابطہ میں ہے، غلط ہے - صحیح یہ ہے کہ فلاں فعل ضابطہ میں ہے اسلیے نیک ہے -

خالص نیک چیز اس دنیا میں صرف نیک ارادہ ہے - دنیا کی ہر شے اضافی قدر و قیمت رکھتی ہے اسکا اچھا استعمال ہو تو وہ اچھی ہے برا ہو تو بری - مگر نیک ارادہ اس اصول سے مستغنی ہے وہ بہرحال نیک ہے

یہ نیک ارادہ تجزیہ کرو تو اس سے زیادہ نہیں کہ فرض انسانی (duty) کو ادا کرنے یا ضابطہ (Law of duty) حیات پر پورا اترنے کی ایک آرزو ہے۔ یعنی ارادہ نیک جب ہوتا ہے جبکہ ہم فرض انسانی یا ضابطہ حیات کو اپنے اوپر جاری کرنا چاہیں۔ مرکزی چیز فرضیت ہے۔

ادائے فرض سے پہلے عامل کے لیے دو شرائط ہیں۔ ایک سلبی۔ دوسری ایجابی۔

سلبی شرط یہ ہے کہ وہ رسماً وعادتاً ادا نہ ہو۔

ایجابی یہ کہ وہ احساسِ فرض کے ساتھ ادا ہو۔

ارادہ میں احساس فرض آیا تو وہ نیک ہوگیا۔ وہ نیک ہے تو انجام کی نیازمندی باقی نہیں رہتی انجام بد ہو جب بھی ہم مجرم نہیں۔ تم نے پورے احساس کے ساتھ مرنے والے کی سوکھی ہوئی زبان پر پانی ٹپکایا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ تم نے فرط محبت سے اُسے اٹھا لیا مگر اس کی ٹوٹی ہوئی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوگئی۔ وہ درد سے کراہا اور اُس نے دم توڑ دیا۔ تم اپنی لغزش پر کانپ اٹھے۔ مریض کو تم نے صحیح دوا دی مگر وہ زہر ثابت ہوئی۔ اس معاملہ میں چونکہ ارادہ نیک تھا اسلیے یہ افعال نتائج وعواقب کے حسن وقبح سے بے نیاز ہیں۔ نیکی کی بنیاد احساسِ فرض پر ہے۔ احساس فرض نیکی پر مبنی نہیں۔ بنیاد احساسِ فرض ہے نہ کہ نیکی۔

ان تشریحات سے اگر ہم ریاضی کے اصول پر ایک مساوات قائم کرنا چاہیں تو وہ حسب ذیل ہوگی:

فرض انسانی کا احساس + ارادہ جو نفع وضرر کی امید وبیم سے پاک ہو = نیکی

تغافل + ارادہ = بدی

عادتاً وہی کچھ کرتے جانا جو کبھی احساس فرض سے کیا تھا = بارگاہ اخلاق میں بدی (اگرچہ قانون کی نگاہ میں یہ غیر قبیح نہیں)

جینٹ اور اسکے ہمنوا:۔ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ بذات خود نیک اور بد کوئی چیز نہیں۔ یعنی خدا

شیطان سے بہتر نہیں - صداقت، انصاف، وفاشعاری، حسن کلام، صناعی، جمال - یہ سب خوبیاں نہ ہوئیں -

کانٹ :- خوبی دو قسم کی ہوتی ہے - فطری خوبی اور اخلاقی خوبی - فطری خوبی وہ ہے جو ہم میں محض اعتراف کا جذبہ پیدا کردیتی ہے - اخلاقی خوبی کے لیے فرض انسانی کا احساس اور بے لوث ارادہ لازم ہیں - فطری نیکی تو ایک قسم کی عیش پرستی ہے - اسلیے اسکی جانب ہمیں ملتفت نہیں ہونا چاہیے - یہ جذبات کی غلامی یا اپیکیوریت ہے -

جینٹ :- صرف اسی ایک جرم سے کہ فطری نیکی ہمارے جذبات میں سرور اور ٹھنڈک پیدا کرتی ہے ہمیں اُسے جذبات کی غلامی کہہ کر الگ نہیں ہونا چاہیے حسین کلام، صناعیت، سائنس ہماری روح میں کونسے جذبات عیش کو بھی متاثر نہیں کرتے - تو پھر انکو کیا نام دیا جائیگا؟ یہ مانا کہ ان کا اچھا یا برا استعمال انہیں اخلاقی نیکی یا بدی میں شامل کردے سکتا ہے - مگر استعمال سے قبل انہیں کیا کہوگے؟ حسن، شجاعت، حاضر جوابی خود اپنے آپ میں بنیادی بھلائیاں ہیں - اخلاقی بھلائیاں ان بنیادی بھلائیوں کے اچھے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں - اخلاقی بھلائیوں پر عمل پیرا ہونے سے ایک سیرت نمودار ہوتی ہے اور وہ روح کی اصلی نیکیوں مثلاً قوت، وجاہت، صفاء باطن اور خلوص کی تنفیذی شکل کے سوا کچھ نہیں - کانٹ کا یہ کہنا کہ نیک ارادہ کے سوا کوئی دوسری شے نیک نہیں اخلاق کو تصنوعیت کا رنگ دینا ہے - اپیکیورس کی مسند پر بیٹھتا ہے - اس کا یہ کہنا تو بجا ہے کہ نیک ارادہ اخلاقی بھلائی ہے - مگر صرف اسی قدر کہنا درست نہیں کیونکہ اسکے علاوہ بھی حقیقی یا اصلی نیکیاں ہیں - مثلاً ذہانت، عزم، ضبط نفس، اقتصاد، اعتماد علی النفس بذات خود روح کی نیکیاں ہیں - یعنی اخلاق کی بنیاد نیکی ہے - ضابطہ یا فرضِ انسانی کا صرف احساس نہیں - بلاشبہ نیک ارادہ یا نیت نہایت بلند مقام رکھتے ہیں - مگر اخلاق کے مبانی اور بھی ہیں - اگر نہ ہوتے تو تہذیب و تعلیم کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی - ہر کوئی اپنے نیک ارادہ سے اپنی راہ کاٹتا اور بڑھتا جاتا - حالانکہ بہت سی راہیں ایسی ہیں کہ تم نے انہیں بہتر اور مفید سمجھ کر اختیار کیا مگر وہ تمہیں ہلاکت کی جانب

لے گئیں - نیز اخلاقیات میں یہ اصولی طور پر موضوعیت (Subjectivity) کا اقرار ہے - اپیکیورس کو صحیح کہنا ہے - اخلاق کو معروضیت (Objectivity) سے نیچے کھینچ لانا ہے - حالانکہ اپیکیورس سے ہمارے اختلاف کا نقطۂ آغاز ہی یہ تھا کہ اس نے اخلاق کو ایک موضوعی انتخاب سمجھا اور ہم نے اُسکی خارج میں ایک مستقل شکل دیکھی -

کانٹ کی نگاہ میں نیکی کی بنیاد ضابطہ پر ہے - مگر ضابطہ کا مصنف معلوم نہیں - بس ضابطہ فرض انسانی ہے اور انسان کے اندر آفاق گیر بنیادوں پر معروف و معلوم ہے - اگر ایسا ہی ہے تو جب ایک برائی عالمگیر بنیادوں پر رائج ہو جائے تو اُسے کیا کہو گے ؟ کیا اُسے نیکی سمجھ لو گے ؟ نیز یہ کہ کسی دستور یا ضابطہ کو یہ خداوندی حقوق دے دینا کیوں صحیح تسلیم کر لیا جائے ؟ انسان نے سیاسیات کے معرکوں میں خون کی ندیاں بہا کر یہی وہ بصیرت ہے جسے حاصل کیا ہے - اُس نے دریافت کر لیا ہے کہ تخت کو یا کسی ضابطہ اور قانون کو مطلقیت یا خداوندی حقوق دینا کسی طرح بھی جائز نہیں -

اپیکیورس :- کانٹ ایک ایسے فرض انسانی کا قائل ہے جسکی مطلقیت کو وہ کسی استدلال کے بغیر قبول کر لیتا ہے - اُسے کورانہ قبول کر لینے کے لیے کہتا ہے - یہ کوری بصر کے سوا کچھ نہیں - انسانیت کے اعزاز کے خلاف ہے - اسکے برعکس خوشی کی تلاش ہمارے لیے ایک وجدانی شے ہے - ہماری جبلت ہے - خدا نے اپنے ہاتھوں سے ہم میں پیدا کی ہے - اسے چھوڑ کر ہمیں کانٹ کی صدائیں ایک اندھے قانون کی جانب کیوں بلاتی ہیں ؟

علمائے افادیت :- کانٹ کے دعاوی میں تناقض ہے - وہ کہتا ہے ایفائے عہد اور ہمدردی بنی نوع کا ہمیں ارادہ کرنا چاہیے ورنہ احتیاج کے مواقع پر ہم کسی دوسرے سے امید نہیں رکھ سکینگے - صاف طور پر یہ افادیت ہے - انجام بینی ہے - اور وہ نہیں جسے کانٹ نے عالمگیر ضابطہ یا فرض انسانی کہا تھا جسکے استبداد کے سامنے ہمیں وہ جھک جانے کے لیے کہتا ہے جسکی سرکار میں استدلال کا گذر

ممکن نہیں یعنی خود اسکی اپنی نگاہ میں اخلاق کا موضوعی مقام ثابت ہے۔

جینٹ :۔ کانٹ کی اگر خامیٔ فکر کو درست کردیا جائے تو مسئلہ کی صحیح شکل ہمارے سامنے آجائیگی۔ ریاضی تعبیر میں اگر کوئی کانٹ کی مساوات اخلاق کو درست کرنا چاہے تو اُسے اُلٹ دینا چاہیے۔ یعنی فرض انسانی کی بجائے ہمیں نیکی (Good) کو اخلاق فاضلہ کی بنیاد تسلیم کرلینا ہوگا۔ رہا یہ کہ فرض انسانی کو کیسے اور کس اسپرٹ میں ادا کیا جائے؟ اس خصوص میں کانٹ نے جو کہا ہے ہمیں اُس سے کلی اتفاق ہے۔

مساوات کی صحیح صورت : نیک افعال + ارادہ (عمل) = فرض انسانی

بد افعال + ارادہ (عمل) = تغافل

اپنے پورے مطالبات کے ساتھ یہ اخلاق کا معروضی نظریہ ہے۔ یعنی نیکی خارج میں موجود ہے۔ بعض افعال خود نیک ہیں اور بعض بد۔ فرضِ انسانی یہ ہے کہ نیک کو اختیار کرے اور بد کو رد کردے۔

کانٹ :۔ کائنات ارضی میں "اخلاقی شخص" صرف انسان ہے۔ کیونکہ صرف یہی "اخلاقی عامل" (Moral Creature) ہے۔ صرف اسی کے دم سے یہ زمین کارگاہِ عزم وعمل ہے۔ باقی جو کچھ ہے اسکے لیے حصول مدعا کی راہ میں ایک واسطہ (thing) ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے لیے ہے۔ انسان ناقابلِ انفساخ ہے۔ یہ مقصود کائنات ہے۔ کسی کو اِسے منسوخ کردینے کا حق نہیں۔ خود اِسکو یہ حق حاصل نہیں کہ یہ اپنی ذات کا احترام نظر انداز کردے۔

شلائیر میخر :۔ خدا کا وہ تخیل جس پر نیکی کو مبنی خیال کیا جائے جسکی فرمانبرداری کی راہ میں استدلال کو روا نہ رکھا جائے، انسان کے مرتبہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ اُسے "اخلاقی شخص" کی حیثیت سے نیچے کھینچتا ہے۔ اُسے قابلِ تنسیخ قرار دیتا ہے۔ اپنے اِس حسین وجمیل تصور کی کانٹ خود تنقیض کررہا ہے۔ وہ اُلجھ گیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ نیکی بنیاد ہے۔ اسکو اختیار کرنا انسانی فرض ہے۔ اُسے مدح وذم کی بیم ورجا سے بالا ہوکر ادا کرنا لازم ہے۔ معروضیت کی یہ کامل تعبیر ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

[یہ مقالہ ۱۲ ستمبر سنہ ۴۰ء کو "انجمن اسلامی تاریخ و تمدن" کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا گیا]

حضرات!

اس مقالہ میں مجھے آپ کے سامنے اس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقاء

اہلِ علم کے اس مجمع میں مجھے اس حقیقت کی توضیح پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر

تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائیٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبیعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم Prerequisites، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائیٹی میں بہم ہو گئے ہوں پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں،

اسی طرح کا جماعتی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبیعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی، ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزون و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اسکو (Ideological State) کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت

اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اسکو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ رگ پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرون ہند کے وہ ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (Nation State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک پیش نظر

مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اس کے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزا سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں انکے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، انکی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپکو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اِس تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام

اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں تمہاری اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال و حرکات ما ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد یہی نیشنلزم اور نیشن اسٹیٹس ہیں، ان کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور اپنے نیشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپکی عقل یہ قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار رہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے

سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جسکی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم پر اسلیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے مالیات، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِنکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِنکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہ ہو ٹھیرتے۔ اِنکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِن کے وزرائے خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شائد اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ

ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جنکے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جنکی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے انکے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیش نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا

خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشو و نما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اُسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اُسکے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر،

قربانیاں کرکے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، بااصول، خداترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائیٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخرکار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

حضرات! یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ آپ سب اہل علم لوگ ہیں۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے

لیڈر شپ نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار، لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈر شپ اور اُن ہزار ہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فشتے، گیوستے، نیتشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدو جہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر یہ ناقص نظامِ تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر موسیو رینو یقین رکھتے تھے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم

چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ مونجے یا سادر کر ہو یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اسکے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر مسلمان ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جارہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں، بلکہ الٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر، ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاس قدسیہ"

سے يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکہ جمیگا؟
اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دھندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس
چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر
فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم
سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس گروہ انبوہ جس کا
میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکوں کا
خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا
ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے
اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ——— پھر جس لیڈرشپ کی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی
لیڈرشپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا
ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مرجائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔
ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی
فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈرشپ اور وہ لیڈرشپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو،
اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"
اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی
طرف کی ہو، تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معیّن کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُس کا
انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات،

اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزرا تک فراہم کر سکتی ہے، مگر برانہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات آپ ہی کے اس نظام تعلیم تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظام تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیر مال، ایک وزیرِ جنگ ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں انکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر ابن عبد العزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود، نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں نظام حکومت میں نہیں، صرف اسکی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا، اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا

وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی مسلمان قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ حکومت کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سد راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

حضرات! اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے آپ کے سامنے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں

کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اِس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات ملتی ہی نہیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اِس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظمِ مملکت کے نتیجے تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا ہیں اسی ماخذ

سے اس تحریک کے طریقِ کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ معاشی انتفاع (Economic exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھ خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اِس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتداء میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent)

اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظ دیگر یہ آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہوسکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خودمختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جاسکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خودمختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز مجسٹی نہیں ہے۔ مجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریادرس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے

ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کردے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابند حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہ راست پیش کردیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کرکے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کردیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اسکی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپکے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہوسکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں اسکے لیے کشش [illegible] سی [illegible] صفت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے - جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے - آج دنیا آپ کے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اسلیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور کوئی مقصد نظر آتا ہے - لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا- آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائیگی - یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں -

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی - پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا - پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا - رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز

میں محسوس ہوا، اسلیے الکفر ملۃ واحدۃ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کرکے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی

کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جدوجہد مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اُسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر وہ کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، . . . . اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے

ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جاکر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند اور بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہوجانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخرکار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہوگیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں

کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علی کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لیکر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے

حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر ان کے دل اندر سے بھنچ رہے ہونگے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اس کو کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی ائیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابو سفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہ وحشی قائل

ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۸ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگ جو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور ڈاکے تھے۔ ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروروں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا

تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو پیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی

پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھدیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہوسکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہوگیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کرسکتے اسلیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہوگیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (آئیڈیلیسٹ) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کردیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آگئے۔ تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہوگیا۔

حضرات! یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی

اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اُس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی امیدوں کا لو اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن، جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کرینگے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے صرف چند کلمے اور عرض کرنے ہیں جنکے بعد میں اپنی اس سمع خراشی کو ختم کر دونگا۔ تقدیر الٰہی نے آپکے اس علیگڈھ کو ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز اعصاب (Nerve-centre) بنا دیا ہے۔ میں اس امر واقعی کا پورا ادراک رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے آج سے چار پانچ سال پہلے علی گڈھ ہی کو مخاطب کر کے اُس نئے نظام تعلیم کا ایک نقشہ پیش کیا تھا جسکی، میرے نزدیک اسلام کی نشأۃ جدیدہ کے لیے ضرورت ہے، اور آج پھر اسی ادراک کی بنا پر میں علیگڈھ ہی کو مخاطب کر کے اُس تحریک کا نقشہ پیش کر رہا ہوں جو اسلامی طرز کا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ہی ممکن تحریک ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جو کچھ پہنچانا تھا اور جس مناسب جگہ پہنچانا تھا، میں پہنچا چکا ہوں۔ اب اسکی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کہ میں آپکے دل بھی بدل دوں۔

مطبوعات

اسلام زندہ باد مرتبہ عبدالمجید صاحب قرشی - سیرت کمیٹی پٹی (ضلع لاہور) قیمت عہ فی جلد -

کتاب دو بابوں پر منقسم ہے - پہلے باب میں کچھ غیر معمولی آدمیوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کی حکایتیں درج ہیں - یہ حکایتیں کچھ ایسے انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ انہوں نے کرشموں اور معجزوں کی صورت اختیار کرلی ہے - اور دراصل مرتب کا مقصد بھی یہی دکھلانا ہے کہ اسلام دنیا میں کن کن عجیب و غریب طریقوں سے پھیلتا ہے - مثلاً ایک بنیے کا بیٹا اسلیے مسلمان ہوا کہ کلمے کا روپیہ ایک روپیہ چھ آنے میں فروخت ہوگیا - ایک انگریز جرنلسٹ ہندوستانی مسلمانوں کا پلاؤ کھاتے ہی اسلام پر فریفتہ ہوگیا - اور ایک ہندو عورت اس وجہ سے صداقت اسلام کی قائل ہوگئی کہ اسکی ناک میں ہندو عورتوں کے جسم سے بو آتی تھی اور مسلمان عورتوں کے جسم سے نہ آتی تھی - ممکن ہے کہ یہ قصے صحیح ہوں - ان سے زیادہ عجیب قصوں کے بھی صحیح ہونے کا امکان ہے - مگر یہ سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ ان مختصر افسانوں کی تبلیغی قدر و قیمت آخر کیا ہے - نہ انہیں پڑھ کر کوئی غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر ایمان لاسکتا ہے، اور نہ ان کے مطالعہ سے کوئی مسلمان اپنے دین کی تبلیغ کے لیے تیار ہوسکتا ہے - البتہ جاہل مسلمان عوام انہیں پڑھ پڑھ کر جھوم ضرور سکتے ہیں -

اس باب کا عنوان ہے "اسلام کی شان"۔ ناظرین کی توجہ مبذول کرنے کے لیے پہلی چار حکایتیں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے روایت کی گئی ہیں ؟ اس سے ذرا ہٹ کر خالد لطیف گابا کا نام آتا ہے -

دوسرے باب کا عنوان ہے "مسلمان کی شان"۔ اس میں تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین

کی بعض شخصیتوں کے احوال اور کارنامے درج کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جنکی اعلیٰ سیرت، بلند اخلاق اور معرکہ آرائیوں نے اہل دنیا کے دلوں پر اسلام کا سکہ جمایا۔ کتاب کے اس حصہ میں ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سلطان صلاح الدین ایوبی اور مصطفےٰ کمال ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی پراگندہ خیالی کا مظاہرہ ہے جس میں آج کل عام طور پر مسلمان مبتلا ہیں۔ دونوں حصوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جو اسلام کی اصل روح و جوہر کا اظہار کرتے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب میں وقت کی مانگ کا زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ اور اسے معنون کیا گیا ہے مسٹر جناح، سر سکندر حیات خاں اور مسٹر فضل الحق جیسے بزرگ اور ثقہ مسلمانوں کے نام۔

ناموران اسلام تالیف محمد حسین حسان صاحب جامعی۔ قیمت مجلد عہ۔ مکتبۂ جامعہ دھلی۔

اس کتاب کا نام غلطی سے "ناموران اسلام" رکھ دیا گیا ہے۔ دراصل یہ نامور مسلمانوں کا تذکرہ ہے اور "مسلم نیشنلزم" کی ضروریات کے لیے لکھا گیا ہے۔

سید جمال الدین افغانی نے پچھلی صدی میں "مسلم نیشنلزم" کی تحریک اٹھائی تھی۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں تو یہ تحریک بہت جلدی مقامی وطنی نیشنلزم میں تحلیل ہو گئی مگر ہندوستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہاں اسے گہری جڑیں پکڑ لیں۔ اسی زمانہ میں سر سید احمد خاں نے بھی اپنی تعلیمی و سیاسی تحریک کی بنیاد اسی "مسلم نیشنلزم" پر رکھی۔ اس وقت سے آج تک ہندی مسلمانوں کی ساری علمی، تہذیبی اور سیاسی زندگی اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام فکر جہاں بھی قائم ہوگا اسکی فطری برائیاں ساتھ ساتھ ظہور میں آئینگی۔ انہیں برائیوں میں سے ایک ہیرو ورشپ بھی ہے، بلکہ دراصل قومی رہنماؤں اور لیڈروں کی پرستش قوم پرستی کی جان ہے۔ اول اول یہ بدعت مولانا شبلی مرحوم نے نکالی۔ ناموران اسلام کا سلسلہ سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کیا تھا جس میں عمر فاروق، مامون

عباسی اور ملک شاہ سلجوقی، سب یکساں نامور اسلام تھے - اس کے بعد سے یہ تمیز ہی اٹھ گئی کہ فی الواقع اسلام کے نقطۂ نظر سے کس شخص کی کیا حیثیت ہے - ہر مسلمان جس نے کسی حیثیت سے دنیا میں نام پیدا کر لیا، نامور اسلام قرار دے لیا گیا، خواہ وہ اسلام کا مجرم ہی کیوں نہ رہا ہو۔ "مسلم قوم" کو فخر کرنے کے لیے چند تاریخی بت درکار ہیں تاکہ ان کے کارناموں اور ان کی شہرت کا سہارا لیکر یہ سر اٹھا سکیں یہ مقصد جن شخصیتوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہو انہیں ہیرو بنا لیا جائیگا اور وہ زبردستی اسلام کے سر پھینک دیئے جائینگے -

یہ کتاب بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - اس میں جہاں سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، عمر ابن عبدالعزیز، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین جیسے حضرات ناموران اسلام ہیں وہیں جعفر برمکی، متنبی، ابن سینا، حافظ شیرازی، ابو الفضل، غالب، سید احمد خاں، اور مصطفےٰ کمال جیسے لوگ بھی غریب اسلام ہی کے نامور بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں اس مجموعہ کے مطالعہ سے بچوں میں نیشنلزم کی اسپرٹ تو یقیناً پیدا ہوگی، لیکن وہ یہ نہ جانیں گے کہ اسلامی تحریک کے چلانے والے کون تھے اور اس سے انحراف کرنے والے بلکہ اسکی جڑ کاٹنے والے کون - تاہم اس لحاظ سے یہ کتاب ضرور مفید ہے کہ بہت سے بزرگوں کے مختصر حالات اس میں یکجا مہیا کر دیئے گئے ہیں زبان سلیس اور صاف ہے - پیرایہ بیان بھی بچوں کے لیے اچھا ہے -

ٹیپو سلطان | مرتبہ ایم - عبداللہ بٹ صاحب - ضخامت ڈھائی سو صفحات - قیمت غیر مجلد عہ - مجلد دو روپے - قومی کتب خانہ - لاہور -

یہ کتاب پنجاب کے وطن پرست مسلم طلبہ نے شائع کی ہے - مختلف حضرات کے پیغامات، مضامین اور نظموں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے - لکھنے والوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اپنے کو "ترقی پسند" یا آزاد خیال کہتے ہیں اگرچہ بعض "غیر ترقی پسند" بھی شریک محفل ہو گئے ہیں - لیکن کسی نے ٹیپو سلطان

کی سیرت اور شخصیت پر گہری نظر نہیں ڈالی ہے۔ قریب قریب ہر ایک نے اسکو ہندوستان کی
جنگ آزادی کا پہلا ہیرو اور نیشنلزم کا پہلا علمبردار ٹھیرایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ٹیپو ایک غلط
ادارے یعنی بادشاہت کا نمایندہ تھا۔ اس جرم کی اسے جتنی چاہو سزا دے لو۔ مگر وہ بیچارا اتنا گیا گزرا
تو نہ تھا کہ اسے آجکل کی قوم پرستی یا وطن پرستی کے تخیل سے وابستہ کر دیا جائے۔ اچھا خاصا نیک مسلمان
تھا اور کسی کالج میں نہیں گیا تھا۔ اُسکے سوانح حیات سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ سی آر داس، اگو کھلے
اور طیب جی ٹائپ کا انسان تھا۔ ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہ کر انگریزی سامراج کی مخالفت
کرے نیشنلسٹ نہیں ہوجاتا۔ بہتر یہ ہوتا کہ ٹیپو سلطان کو اُسکے اصلی رنگ میں پیش کیا جاتا۔ اور
وہ اصلی رنگ اُسکی پاکیزہ شخصی زندگی اور اس کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ اُسکی شخصیت کی بلندی کا حقیقی جائزہ
لینا ہو تو اسکو صرف انفرادی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اجتماعی کردار میں نہ وہ نیشنلسٹ تھا نہ مجاہد۔
کتاب بہر حال اس لحاظ سے یقیناً کارآمد ہے کہ ٹیپو کے بیشتر تاریخی حالات ایک جگہ مرتب کر دیے
گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ اور جلد بھی خوشنما ہے۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ | تالیف محمد مرزا صاحب دہلوی۔ قیمت ہر چہار حصہ دو روپے۔ دائرۂ
ادبیہ، دریا گنج دہلی۔

اب تک اس کتاب کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔ مصنف کے اعلان کے مطابق چار حصے باقی
ہیں۔ عہد حاضر کے بڑے لوگوں میں صرف سیاسی مدبروں اور حکمرانوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں سے
بعض مر چکے ہیں اور زیادہ تر زندہ ہیں۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسلم ممالک کے ہر مشہور آدمی
کو بڑا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پہلے چار حصوں میں دس نام ہیں جن میں سات مسلمان ہیں۔ باقی حصوں
میں آٹھ مزید شخصیتوں کا ذکر ہے جن میں ایک مسلمان ہے۔ یعنی عہد حاضر کے سولہ بڑے لوگوں میں سے
خدا کے فضل سے آٹھ مسلمان ہیں۔ اگر کتاب کسی ہندو نے لکھی ہوتی تو ۱۶ میں سے ۱۲ ہندو ہوتے!

شائع شدہ حصوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر سو فیصدی نیشنلسٹ ہے اور علمی تحقیق سے نیشنلزم کی دشمنی جیسی کچھ ہے، ظاہر ہے۔ مصنف نے مسلمان لیڈروں اور بادشاہوں کی تعریف و توصیف اور انکے کارناموں کو سراہنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے، اور انکی کمزوریوں کی خاصی ستر پوشی کی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ترکی نیشنلزم سے انکو جتنی ہمدردی ہے اتنی عرب نیشنلزم سے نہیں ہے۔ جن باتوں پر وہ قوم پرست ترکوں کو سراہتے ہیں، انہی باتوں پر قوم پرست عربوں کی مذمت کرتے ہیں۔ کیا انکی نگاہ میں عرب اسلیے قصور وار ہیں کہ انہوں نے ترکی امپیریلزم کا جوا اپنے کندھے سے اتارنے کی کوشش کی؟

ایران، عراق اور مصر میں جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی "تغیرات" ہوئے ہیں، وہ سب مصنف کی نگاہ میں "اصلاحات" ہیں اور وہ ان کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلم قوم پرستی کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اگر تعزیہ کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ لے تو علم جہاد بلند کر دیا جائے، اور نام کا مسلمان اگر اسلام کے گلے پر چھری بھی پھیر دے تو زندہ باد کا نعرہ لگایا جائے، مگر عوام کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لیے نام دونوں موقعوں پر اسلام ہی کا لیا جائے۔

خود دار خاتون | ترجمہ محمد مرزا صاحب دھلوی قیمت ۸ / دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دھلی۔

آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے۔ وائلڈ نہ تو اچھا افسانہ نگار تھا اور نہ اچھا شاعر۔ اُس کا اصل میدان تھا ڈراما اور اس میں بھی صرف کمیڈی۔ ادبیات میں اُس کا نظریہ تھا فن برائے فن۔ اس عجیب اور بے معنی نظریے نے جسکے حامی خود اُسکے ہمعصروں میں بھی بہت کم تھے، وائلڈ کی تصانیف پر کچھ اچھا اثر نہ ڈالا۔ معاشرتی مسائل سے اُسے واقعی دلچسپی تھی مگر اپنے مخصوص طرز فکر کی وجہ سے وہ سوسائٹی کی ہمدردی نہ حاصل کر سکا۔ جو نقوش اس نے انگریزی ادب پر چھوڑے ہیں انکی وجہ سے وہ مشہور کم بدنام زیادہ ہے۔ مثلاً اخلاقیات کا وہ سرے سے قائل نہ تھا جسکی جھلک اس کے افسانوں

ڈراموں اور نظموں میں صاف نظر آتی ہے۔ سماج کی اصلاح میں وہ کچھ کامیاب رہا۔
بایں ہمہ تمثیل پیش نظر ایک دلچسپ قصہ ہے جو کسی قدر سبق آموز ضرور ہے۔ ترجمہ کی زبان اچھی اور صاف ستھری ہے۔

اسلام کا نظام سیاسی | تالیف حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ نمبر ۴۸/۹۵ چمن گنج - کان پور۔

اس موضوع پر قریب کے زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ خالص علمی تحقیق اور صحیح اسلامی ذہنیت کے بجائے جس چیز نے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے وہ "مسلم قوم پرستی" کا جذبہ ہے، اسی وجہ سے اسلام کے تصور ریاست اور نظام حکومت کو سمجھنے اور بیان کرنے میں سخت غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو نظریہ ایک غیر قومی اسٹیٹ بنانا چاہتا ہو، قومیت اور قوم پرستی کی عینک چڑھا کر اسکی صحیح صورت کیسے دیکھی جاسکتی ہے۔

زیر نظر کتاب دوسری تحریروں کی بہ نسبت بدرجہا غنیمت ہے، اگر مصنف نے بلا ضرورت مسلمانان ہند کے قومی مسئلے اور ہندو و انگریز کے ساتھ ان کے تعلقات کی بحث چھیڑ کر کتاب کی اصولی حیثیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ پھر جہاں اصولی بحث کی ہے وہاں بھی اسلامی اصولوں کی برتری دکھاتے ہوئے مسلم قوم کو اچھالنے کی بے موقع کوشش کی ہے اور جابجا دوسری قوموں اور جماعتوں پر چوٹیں بھی کرتے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے دل کا بخار تو نکل جاتا ہے، مگر اسلام کی طرف سے دلوں پر جو قفل چڑھ جاتے ہیں اس کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔

اصل مسئلہ کی تحقیق بہت زیادہ حد تک صحیح ہے، لیکن سائنٹیفک نہیں ہے۔ مثلاً دور حاضر کے دوسرے سیاسی، معاشی و معاشرتی نظاموں کو صرف برا کہا گیا ہے مگر انکے بنیادی اور اساسی اصولوں پر تنقید کر کے انکی کمزوری ثابت نہیں کی گئی ہے۔ کتاب پڑھکر کوئی شخص ہرگز

نہیں سمجھ سکتا کہ اسلام دوسرے نظامہائے سیاسی سے کیوں بہتر ہے - ایک اور بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ اسلامی اسٹیٹ کے نظام اور دستور العمل پر کسی قدر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی ہے لیکن ہر پہلو تشنہ ، غیر مرتب اور غیر مدلل ہے - تیسری کمی یہ ہے کہ اصطلاحات کی استعمال اور طرز بیان میں علم السیاست کی زبان سے کافی مدد نہیں لی گئی ہے - اس کا لحاظ بہت ضروری تھا - مجموعی طور پر کتاب اچھی ، پُر از معلومات اور قابلِ مطالعہ ہے -

ہندوستانی ضخامت ۷۹ صفحات مجلد - قیمت ۱۲ / ر مکتبہ جامعہ - دہلی -

یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر ڈاکٹر تاراچند ، مولوی عبدالحق ، بابو راجندر پرشاد ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ، پنڈت کیفی اور آصف علی صاحبان نے " ہندوستانی زبان " کے متعلق ارشاد فرمائی تھیں -

زبان خدا کی ایک نعمت ہے جو انسان کو اسلیے ملی تھی کہ ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے - لیکن نیشنلزم اور سیاسی تعصبات نے جہاں خدا کی بہت سی نعمتوں کو لعنت بنایا ہے وہاں اس نعمت کو بھی لعنت بنا ڈالا - ہندوستان میں فطری رفتار کے ساتھ خود بخود ایک ایسی زبان نشو و نما پا رہی تھی جس میں اس ملک کے زیادہ سے زیادہ باشندے تبادلہ خیالات کر سکتے تھے - اس ملعون نیشنلزم نے آکر اسکی جڑ کاٹ دی اور مصنوعی زبانیں تیار کرنے کا راستہ لوگوں کو دکھایا - اب یہ دیکھ کر مزید غصہ آتا ہے کہ وہی لوگ جنکی رگ رگ میں سیاسی اغراض کا زہر اترا ہوا ہے ، مصلح کا روپ دھارن کرکے آتے ہیں اور ہندی اور اردو کے درمیان ایک بیچ کی مصنوعی زبان " ہندوستانی " پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - ایسی ہی منافقت پر غالب نے کہا تھا کہ " دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا " یہ بناوٹی زبان جو محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر پیدا کی جا رہی ہے ، انتہائی تکلف کے ساتھ لکھی اور بولی جاتی ہے - جن حضرات کی تقریریں اس مجموعہ میں درج کی گئی ہیں ان میں سے اکثر نے بہت سوچ

سوانح کو بڑی محنت سے وہ "ہندوستانی" لکھی ہوگی جسے انہوں نے اپنی تقریروں میں ذریعۂ اظہار خیال بنایا ہے۔ اگر انہی حضرات سے کہا جائے کہ ذرا کھڑے ہو کر برجستہ کسی مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کیجیے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ "اپنے دیس کی یہ کھڑی بولی" چند جملوں سے زیادہ نہ بول سکینگے۔

خلاصۃ القرآن - پارۂ عم | مولوی اظہار الحسن صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر۔ قیمت ۱۲؍ حاجی عبد القیوم تاجر کتب ۱۶ ویلزلی اسکویر۔ کلکتہ۔

عام فہم زبان میں پارۂ عم کی سورتوں کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ کی مختصر تشریح بھی ہے، اور ترجمۂ آیات کے ساتھ سادہ اور مختصر تفسیر بھی۔ زبان میں پوربیت کا اثر غالب ہے۔ کہیں کہیں بلا ضرورت صوفیانہ خیالات کی آمیزش کر دی گئی ہے اور بعض مواقع پر ضعیف روایات کے مطابق تفسیر کی گئی ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی عوام کے لیے یہ سلسلہ مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ اشاعت سے پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ لے لیا جائے۔

اساس انقلاب یا مراقبۂ نماز | مرتبہ مولانا ابو الحامد محمدؐ بن عبد اللہ انصاری مقیم کابل۔ قیمت ۸؍ تعداد صفحات ۱۴۲۔ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی۔ مراد آباد۔

لائق مولف حضرت مولانا محمدؐ قاسمؒ صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کے حقیقی نواسے ہیں اور عمر کا زیادہ حصہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی معیت میں گذارے ہوئے ہیں۔ جنگِ عظیم کے زمانہ سے افغانستان میں مقیم ہیں۔ اور حکومت افغانی کی بہت سی سیاسی خدمات انجام دیچکے ہیں۔ اساس انقلاب موصوف کے پختہ خیالات، گہرے مطالعہ اور قرآنی فہم کا مرقع ہے۔ اس میں اُنہوں نے اسلام کے اصلی نظریۂ حکومت وسلطنت کو ملحوظ رکھ کر پوری تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اقامت نماز کے ذریعہ سے انسانوں کی جماعت کس طرح مطلوبہ انقلاب برپا کرنے اور فرائض خلافت انجام دینے کے لیے تیار ہوتی ہے، اور اس ٹریننگ کے بغیر سوسائیٹی میں اسلامی انقلاب برپا ہونا کیوں ناممکن

ہے - الحمدللہ کہ پوری کتاب نہایت قیمتی جواہر سے لبریز ہے، اور بڑے بڑے لطیف نکات فاضل مصنف کے قلم سے نکلے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہندوستان سے باہر طویل قیام کرنے کی وجہ سے فاضل مصنف اب اردو لکھنے پر اچھی طرح قادر نہیں رہے ہیں اور انکی تحریر عام ناظرین کے لیے ایک معمّا معلوم ہوتی ہے - کیا ہی بہتر ہوتا کہ مولانا کے ان پاکیزہ خیالات کو اردو زبان کا کوئی اچھا ادیب سلیس وعام فہم انداز بیان میں مرتب کر دیتا -

سیاسی انقلابات تالیف مولوی محمد میاں صاحب مراد آبادی معروف بہ "مسلم سوشلسٹ" قیمت ۵ر تعداد صفحات ۸۰ ملنے کا پتہ :- کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مراد آباد -

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں انبیاء کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے دوسرے میں حقوق انسانیت پر بحث کی ہے - تیسرے باب میں ظہور اسلام سے پیشتر کی اور چوتھے میں موجودہ انسانی حالت کا نقشہ کھینچا ہے - پانچویں باب میں عقیدۂ توحید کی تشریح ہے اور چھٹے میں عقیدۂ رحمۃ اللعالمین کی پھر آخری باب میں یہ بتایا ہے کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رحمۃ اللعالمین کا اثر سیاسیات عالم پر کیا ہوا -

اصل اس کتاب کا موضوع نظریۂ سیاسی ہے اور اسکی اساس حجۃ اللہ البالغہ پر رکھی گئی ہے - قابل مولف نے مضمون کو اچھا نبایا ہے - اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا - کاش اتنے بلند نظریات رکھنے والے لوگ یہ محسوس کریں کہ بازار کے چلتے ہوئے ناموں کا سہارا لیکر اٹھنا کس قدر پست درجہ کا فعل ہے - اللہ کے رکھے ہوئے نام "مسلم" میں کس چیز کی کمی تھی کہ اس پر "سوشلسٹ" کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی ؟

حکومت الٰہی اور امامۃ امت کا دستور اساسی یہ دونوں پمفلٹ مولانا ابوالحامد محمد بن عبداللہ انصاری نے تحریر فرمائے ہیں اور کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مراد آباد نے شائع کیے ہیں - قیمت دونوں کی

ہو رہا ہے۔ امامتِ امت کے دستورِ اساسی ہیں مصطلحاتِ سیاسی کی تشریح و وضاحت ہے اور حکومتِ الٰہی میں دستورِ اساسی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ پمفلٹ اصل فارسی سے اردو میں مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی نے ترجمہ کیے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ افسوس ہے کہ زبان اور اندازِ بیان دونوں گنجلک ہیں۔ حقائق بجائے خود قیمتی ہیں مگر انکو پیش کرنیکا طریقہ بہت پرانا ہے اور موجودہ زمانہ کے لٹریچر میں جگہ پانا اسکے لیے مشکل ہے۔

اسلام اِن دی ورلڈ مصنفہ ڈاکٹر زکی علی۔ قیمت للعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

ڈاکٹر زکی علی ترکی النسل مسلمان ہیں۔ مصر میں رہنے کی وجہ سے عربی زبان بھی جانتے ہیں انگریزی بھی سیکھی ہے اور فاصی لکھتے ہیں۔ مصر میں طبابت کر رہے تھے کہ ایک طبی کام کے سلسلہ میں انکو یورپ کے سفر کا موقع ملا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ "لوگوں کو اسلام کے متعلق قطعاً کوئی واقفیت نہیں ہے بلکہ بہت سی بدگمانیاں دلوں میں سمائی ہوئی ہیں"۔ نیز انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ "مغربی ممالک اور اسلامی دنیا کے تعلقات ایک مرض مزمن سے مشابہت رکھتے ہیں" اسلیے انہوں نے ایک ڈاکٹر کی طرح اس مرض کی تشخیص اور علاج کی طرف توجہ کی"۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا معیارِ علم و نظر ہمارے اُن عام نوجوانوں سے جو یورپ جایا کرتے ہیں، کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ اسلام کے ساتھ اُنکو اسلیے عقیدت تھی کہ یہ اُن کا دین آبائی ہے۔ اور مسلمانوں سے اسلیے ہمدردی و دلچسپی تھی کہ یہ اُنکی ہم مذہب قوم ہے۔ اسلیے مذکورہ بالا حالات کو دیکھکر اُن کے دل میں اُسی طرح اسلام اور مسلمانوں کیلیے درد پیدا ہوا جس طرح اُن جیسے بہت سے زائرین یورپ کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، مگر اسلام کے متعلق معلومات کی کمی، صحیح اسلامی فکر و نظر سے محرومی، اور اسلام کو مسلم قومیت کے ساتھ خلط ملط کر دینے کی وجہ سے وہ اُس کام کو انجام نہ

دے سکے جس کا بار انہوں نے محض جذبات کے جوش میں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک طرف تو ایک خوفزدہ ہمسایہ کی طرح اپنے طاقتور ہمسایہ (یعنی یورپ) کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں سے اسکو کوئی خطرہ نہیں ہے، تاکہ ترقی و نہضت کے لیے مسلمان جو کوششیں کر رہے ہیں انکو وہ بدگمانی کی نظر سے نہ دیکھے اور جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دے۔ دوسری طرف وہ اسلام کو چھیل بنا کر مغربی مذاق کے مطابق تیار کرنیکی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اس پر ناک بھوں چڑھانا چھوڑ دے اور مان لے کہ یہ اسلام تو کچھ اُس کی اپنی تہذیب سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ۹ باب ہیں اور دوسرے میں ۴۔ پہلے حصہ میں "پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم"، "اسلام"، "قرآن"، "اسلامی سیاست"، "خلافت"، "اسلامی تہذیب اور اشاعتِ اسلام" وغیرہ کو موضوع بحث قرار دیا ہے۔ اور دوسرے حصہ کے عنوانات یہ ہیں "اسلام کی موجودہ بیداری"، "اسلام کی آزادی"، "اسلام اور بین الاقوامی معاملات" اور "اسلام دنیا میں" یہ عنوانات خود اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ بیچارہ ڈاکٹر اسلام اور مسلمانی کو ایک چیز سمجھ رہا ہے اور جہاں مسلمان کا لفظ بولنا چاہیے وہاں اسلام کا لفظ بولتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خود مسلمان ہی اسلام اور مسلمانی کو اس طرح خلط ملط کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے لگیں تو تعجب کرنا چاہیے اگر ایک مغربی سیاح مشرق میں "اسلام" کو بھیک مانگتے اور بات بات پر جھوٹی قسمیں کھاتے اور ایک ایک کوڑی پر ایمان بیچتے دیکھ کر اسلام کی طرف سے نفرت و حقارت کا جذبہ لیے ہوئے واپس جائے۔

اسلام کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی معلومات اتنی ہی سطحی ہیں مگر مجتہدانہ اظہار رائے کرنے میں انکی جسارت کا وہی حال ہے جو اُن کے طبقہ کے دوسرے لوگوں کا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں "عورتوں کے لیے برقعہ کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے، یہ ایک اجنبی رسم ہے جو باہر سے مسلمانوں میں آگئی ہے۔" اور اسی پر بس نہیں بلکہ یہ بھی کہ "اسلام میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو عورت کو

سوسائیٹی میں وہ جگہ لینے سے روکے جو یورپ کے مہذب ممالک میں اسے حاصل ہے"۔ خیر، یہ تو پھر
بھی ایک جزئی مسئلہ تھا۔ ایک دوسری جگہ تو فاضل ڈاکٹر نے یہ قاعدۂ کلیہ ہی سطے فرمادیا ہے کہ "اگر کسی قانون
کے اتباع سے مضر اثرات پیدا ہوں تو اُس قانون میں ترمیم کرکے اُسے زمانہ کی ضروریات کے مطابق
بنالینا چاہیے"۔ اب اسکے بعد اسلام کی لچک اور سیمابیت میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے؟ خدا کے
بنائے ہوئے قانون کو بندے جب نامناسب سمجھیں، منسوخ کردیں اور اس کی جگہ جو دوسرا قانون
چاہیں خود تصنیف کرکے اس کا نام خدا کا قانون رکھ دیں! کس قدر خوب سمجھا ہے ہمارے طبیب حاذق
نے اسلام کو۔ ایسی ہی تحریروں کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں
کے دل میں اسلام کے لیے جو قوم پرستانہ درد اٹھتا ہے وہ بیچارے اسلام کے لیے نادان کی
دوستی سے کچھ کم بلا نہیں ہے۔

اس تنقید سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کتاب میں عیوب کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ فی الواقع اس میں
دنیا کی مختلف مسلمان قوموں کے متعلق بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہیں جو کسی دوسری جگہ یکجا نہ ملینگی۔

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خار اشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔
ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بےجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

مسرت سرمدی پٹن پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا